روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ

مختلف مکاتبِ فکر کے معترضین کے دلائل کا مکمل و مدلل جائزہ

تصنیف

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ

مکتبۃ السلام سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ

مختلف مکاتبِ فکر کے معترضین کے دلائل کا
مُحکّم و مُدلّل جائزہ

از قلم:

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ناشر

مکتبۃ السلام وسن پورہ گلی نمبر ۲۰ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: روح عذاب قبر

مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانیؒ

اشاعت چہارم: مارچ 2005

تعداد: 2200

زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی

زیر اہتمام: نجیب الرحمان کیلانی فون: 7844157

ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی۔ انجینئر حافظ عتیق الرحمان کیلانی

مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: 35 روپے

ناشر: **مکتبۃ السلام** سٹریٹ نمبر 20، وسن پورہ لاہور

فون: 7844157-7280943

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مرتب نہیں کی گئی، بلکہ یہ میرے ان پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تین سالوں میں ماہنامہ ترجمان الحدیث اور ماہنامہ محدث میں بالاقساط شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کا اصل موضوع وہی تھا جو کتاب کے نام سے واضح ہے۔ اس موضوع کی اہمیت جتنی کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ یا کوئی طبقہ نہ ہوگا جو اس موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ ان مسائل میں کچھ لوگ اگر افراط کی راہ پر چل نکلے اور انتہا کو جا پہنچے تو کچھ دوسرے تفریط کی طرف مائل ہوئے اور دوسری انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ ان حالات میں یہ مضامین ہر طبقہ میں خاصی دلچسپی سے پڑھے گئے اور اب اسی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مختلف اوقات میں چھپنے والے ان مضامین کو یکجا کرنے سے کتاب ہذا میں بعض مقامات پر تکرار واقع ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح کے تکرار کو دور کر دیا جائے۔ مگر اس معاملہ میں مجھے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ایک مقام پر کسی بات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے تو دوسرے مقام پر ذرا تفصیل سے۔ پھر مضمون کی مناسبت بھی اس بات کی متقاضی تھی۔ لہذا اجمال اور تفصیل دونوں اپنے اپنے مقام

پر درست اور ضروری معلوم ہوئے۔ لہٰذا اسے جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ پھر اس تکرار کا بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ بعض ضروری باتیں تکرار کی وجہ سے ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء یوں ہوئی، جن دنوں وحدت الوجود، وحدت الشہود وغیرہ سے متعلق میرے مضامین "ترجمان الحدیث" میں چھپ رہے تھے اور ان میں ضمناً روح اور ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا ذکر بھی آگیا، تو ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب نے روح اور تناسخ سے متعلق چند سوالات لکھ بھیجے جن کا جواب میں نے ذرا تفصیل سے لکھا اور یہ جواب "الاستفسار" کے عنوان کے تحت "ترجمان الحدیث" کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۲ئ میں چھپا۔ اب اس استفتاء پر مزید دو حضرات (جناب عبدالقادر صاحب سومرو، کراچی اور محمد احسان الحق صاحب، یارو خیل۔ میانوالی) کی طرف سے سوالنامے آئے جن میں ان کے تفصیلی جواب کے متعلق لکھا گیا تھا۔

ان سوالات کے جواب میں میں نے ایک طویل مقالہ لکھا، جو کافی عرصہ بعد ماہنامہ "محدث" کی دو قسطوں دسمبر ۱۹۸۳ء اور جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہ طویل مقالہ لکھنے کے بعد شائد مزید استفسارات کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ وجہ یہ تھی کہ ان سوالناموں میں میرے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جب قرآن میں صرف دو بار کی موت اور دو بار کی زندگی ہی کا ذکر ہے تو اس عرصۂ موت میں برزخ کی زندگی کہاں سے آگئی جو اس قدر مشہور ہے؟ اور اس سوال کا جواب کافی تفصیل سے لکھ دیا گیا تھا۔ اسی ضمن میں عذابِ قبر اور سماعِ موتی کے مسائل بھی زیرِ بحث آئے۔

اس مقالہ کے ردِّ عمل کے طور پر تین طرح سے اظہارِ خیال کیا گیا۔ ایک طبقہ نے کہا کہ امام ابنِ تیمیہؒ اور امام ابنِ قیمؒ کو خواہ مخواہ صوفیاء کے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے اور نیز یہ کہ کتاب الروح امام ابنِ قیمؒ کی اپنی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی دوسرے نے تصنیف کرکے اسے امام ابنِ قیمؒ سے چسپاں کر دیا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس مقالہ کی روشِ اعتدال پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے تقاضا کیا کہ اس مقالہ کو پمفلٹ کی صورت میں الگ چھاپ کر شائع کرنا اور عوام میں

مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ جبکہ تیسرا طبقہ اس قدر متشدد ہے کہ وہ سماعِ موتیٰ کے سلسلہ میں کسی بھی استثنائی صورت کو برداشت نہیں کرتا۔ اور میں نے اس استثنائی صورت کے سلسلہ میں جو چند احادیثِ صحیحہ پیش کی تھیں، ان میں سے کسی روایت کو تو مجروح یا موضوع ثابت کیا اور جن روایات میں ایسی گنجائش نظر نہ آئی ان کی تاویل کر کے قرآن کریم کے اس واضح ارشاد " کہ مُردے سن نہیں سکتے" کے مطابق ڈھال لیا اور استثنائی صورت کو ختم کر دیا ـــــ اور اس مطابقت کی صورت یہ پیش کی کہ قبر سے مراد یہ زمینی یا مادی یا حسی قبر یا زمینی گڑھا ہے ہی نہیں۔ بلکہ قبر کے حقیقی معنی وُہ برزخی قبر ہے جو برزخی زندگی یا مرحلہ ۳ میں روحوں کا مستقر ہے۔

اس سلسلہ میں مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط بھی موصول ہوئے۔ ان میں سے نسبتاً مختصر خط جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب (ص ب ۲۵۵۸- مدینہ منورہ) کا ہے، انہوں نے چند سوالوں کے ساتھ میری توجہ اس طرف دلائی ہے کہ میں نے علامہ وحید الزمان کی تصنیف "لغاتُ الحدیث" کے حوالہ سے جو حدیث "خُذُوا شَطْرَ دِینِکُمْ مِنَ الْحُمَیْرَاءِ" درج کی تھی۔ وُہ موضوع ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ وضاحت فرمائی۔ تاہم یہ حدیث صرف تائید کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ لہٰذا اس حدیث کے موضوع قرار پانے کے بعد بھی موقف میں فرق نہیں پڑتا۔ علامہ مذکور کے حوالہ سے ایک ہی حدیث درج کی تھی وُہ بھی موضوع نکلی۔ لہٰذا اسے کتاب ہٰذا سے خارج کر دیا گیا ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل تھے۔ اور یہ اس تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سماعِ موتیٰ کے بارے میں کسی طرح بھی استثناء کے قائل نہیں۔ اس کے بجائے وہ برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم جیسے نظریات کے قائل ہیں۔ ان نظریات کے موجد ـ جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے ڈاکٹر کیپٹن مسعودِ عثمانی صاحب (توحید روڈ۔ کیماڑی کراچی) ہیں۔ میں نے اپنے تیسرے مضمون بعنوان "برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف" میں ان دونوں حضرات کے اختلافات، اعتراضات اور اشکالات کے حتی المقدور تفصیل سے جوابات لکھے۔

چوتھا مضمون لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب موصوف کے ایک متسند پیروکار — جناب اشفاق صاحب (ناظم آباد کراچی) — نے مجھے نہایت تند و تیز لہجہ میں ایک طویل خط لکھا اور مجھے سخت سُست کہنے کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ التماس کی گئی تھی کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا بنظر غائر لٹریچر پڑھ کر اپنے نظریات پر نظر ثانی کر دوں۔ لہٰذا اب میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کے نظریات اور دلائل کا تجزیہ پیش کر دوں۔ چنانچہ چوتھا مضمون "ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ" اسی پس منظر میں سپردِ قلم ہوا اور ساتھ ہی اشفاق صاحب کا خط بھی بعینہٖ شائع کر دیا گیا۔ یہ خط اور اس کا جواب دو اقساط میں شائع ہوئے۔

ان حضرات کی خط و کتابت سے فراغت ہوئی تو جناب چوہدری محمد علی صاحب حنفی کا ایک طویل ترین خط بصورتِ مضمون موصول ہوا۔ تحریر کا انداز اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ یہ مضمون چودھری صاحب کے بجائے کسی ممتاز عالم دین کا ہی ہو سکتا ہے جنھوں نے چودھری صاحب کی آڑ لے کر اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام تر مضمون نیلی سیاہی سے اور رواں دواں شکستہ خط میں تحریر تھا جبکہ نیچے چودھری صاحب کے دستخط اور پتہ کالی سیاہی سے، نسبتاً باریک قلم سے اور ناپختہ خطِ شکستہ میں ثبت تھے۔ جو کچھ بھی تھا، مجھے تو بہرحال جواب دینے سے غرض ہے۔ چودھری صاحب موصوف صرف سماعِ موتیٰ پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ اس کے جواز کو بُنیاد بنا کر اس سے بعد از مرگ اولیاء اللہ کی کرامات اور تصرف فی الاُمور پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اس خط یا مضمون میں سماعِ موتیٰ کے علی الاطلاق جواز کو قرآن، حدیث، اقوالِ صحابہ اور بزرگوں کے اقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں یہ استدعا بھی کی گئی ہے کہ میرے اس خط یا مضمون "سماعِ موتیٰ۔ تصویر کا دوسرا رُخ" کو وسعتِ قلبی سے کام لیتے ہوئے بجنسہٖ محدث میں شائع کر دیا جائے اور اس مسئلہ کا فیصلہ قارئین کرام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

اگرچہ یہ خط یا مضمون بہت طویل تھا، تاہم چودھری صاحب کی خواہش کا

احترام کرتے ہوئے یہ خط پورے کا پورا شائع کر دیا گیا اور میرا جواب اس صورت میں ہے۔ کہ ہر صفحہ میں لائن کے اوپر تو چودھری صاحب کا مضمون مسلسل چل رہا ہے اور لائن کے نیچے حواشی کی طرز پر میرے جوابات مسلسل چلتے ہیں۔ اگر کسی صفحہ پر لائن نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مواد چودھری صاحب کا ہے۔ یہ صورت محض اختصار کی خاطر اختیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون معہ جوابات محدث کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔ کتاب ہٰذا میں اس پانچویں مضمون کا عنوان "سماع موتیٰ سے تصرفاتِ اولیاء اللہ تک" تجویز کیا گیا ہے۔

ان مضامین کے بالاقساط اور مختلف ادوار میں چھپنے سے یہ فائدہ ضرور ہو گیا ہے کہ میرے بیان سے اختلاف رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو اختلاف واعتراض کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور اسی طرح مجھے ان حضرات کو جواب دینے کا۔ اس طرح اس موضوع کے تمام تر پہلو سامنے آ گئے، جو ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی صورت میں شاید نہ آ سکتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو قرآن وحدیث کی تاویلات کے پھندے سے بچائے اور شریعت کا سیدھا سادا اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالرحمٰن کیلانی۔ دارالسلام۔ وسن پورہ۔ لاہور
شوال ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء

فہرست مضامین



الاستفتاء

(یہ استفتاء ترجمان الحدیث ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا)

غلام رسول زاہد قبولہ ضلع ساہیوال سے لکھتے ہیں:
مکرمی جناب کیلانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
تعریف خدا اور توصیف خاتم المرسلین۔

امابعد: بندہ گورنمنٹ کالج لاہور میں سال دوم کا طالب علم ہے ماہنامہ ترجمان الحدیث میں آپ کے مضامین پڑھنے کے بعد دلی طور پر آپ کے قلمی جہاد اور آپ کی علمی استعداد کا معترف ہو گیا ہوں۔ خدا آپ کو ملت اسلامیہ کی بھرپور خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

گزشتہ شماروں میں موجودہ شماروں تک حالاً، آپ کا بصیرت افروز سلسلہ وار مضمون نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود شائع ہو رہا ہے، جس سے آپ کی علمی لیاقت اور گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

اس سلسلے میں چند سوالات ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنے مخصوص انداز سے ان کا حل بیان فرمائیں گے۔ میں اس عنایت کے لئے شکرگزار ہونگا۔ مزید یہ میرے علم میں اضافہ کا موجب ہوگا۔ براہ راست جواب کے لیے ممنون ہوں گا۔

(۱) قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ روح خدا کے حکم "سے" ہے۔ کیا "روح خدا کا حکم ہے" اور "روح خدا کے حکم سے ہے" میں بیّن فرق نہیں؟

(یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ بعض کتب میں "روح خدا کا حکم ہے" درج ہے۔ جیسے کیمیائے سعادت از امام غزالی) اگر ان میں فرق ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں تو کیسے؟

(۲) چونکہ استفسار کرنے والے یہودی تھے۔ اس لیے اگر ہم اس خطاب کو انہی کی طرف تصور کریں کہ "تمھیں اس کے بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے" تو مسلمانوں کی بابت کیا سمجھا جائے؟

(۳) علماء روح کو دو درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جیسے کہ امام غزالیؒ نے انھیں روح حیوانی اور روحِ انسانی کا نام دیا ہے اور علی ہجویریؒ نے نفس زیریں اور نفس بالا کا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں کونسی روح کی طرف اشارہ ہے اور کیوں؟

(۴) کیا ہندوؤں کا نظریہ آواگون اور مشہور شیعہ فرقہ طیارہ کا نظریۂ روح باہمی مطابقت سے مستثنیٰ ہیں؟

(۵) مسلمان فلاسفہ جیسے ابن رشد نے بھی روح کُلّی کا نظریہ پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ہر روح جسم سے جدا ہونے کے بعد روحِ کلّی میں چلی جاتی ہے۔ کیا اس نظریہ اور ہندوؤں کے نظریۂ تناسخ کا سرچشمہ ایک ہی نہیں؟

(۶) غنیۃ الطالبین میں حدیث مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "نیک روح بدن سے یوں بآسانی نکلتی ہے جیسے برتن سے پانی نکلتا ہے جبکہ بری روح بدن میں پھیل جاتی ہے اور اس شدت سے کھینچی جاتی ہے کہ تمام جسم درد سے بلبلا اٹھتا ہے۔ (در بابِ آخرت) یہ مفہوم حدیث ہے الفاظ نہیں۔ کیا آپ اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں؟

(۷) روح اور بدروح میں فرق واضح کریں؟ شکریہ!

الجواب

۱۔ "امرِ ربّی" کا مفہوم

"روح خدا کے حکم سے ہے" یا "روح خدا کا حکم ہے"۔ میں الفاظ کا فرق تو ضرور ہے مگر نتیجۃً مفہوم دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ‌ ‌ دیکھو سب مخلوق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔ (۷/۵۴)

اس آیت میں "اَلْخَلْقُ" سے مراد تمام مخلوق اور "اَلْاَمْرُ" سے مراد تمام قسم کے احکام ہیں

ان تمام احکام میں سے ایک حکم رُوح بھی ہے۔ اب اگر "الأمر" کو ایک اکائی تصور کیا جائے تو رُوح اس کا جزو ہوا جیسے کہ ارشادِ باری ہے :۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (۱۷/۸۵) رُوح اللہ کے حکم سے ہے۔

اور اگر "الأمر" سے مراد تمام احکام لیے جائیں تو رُوح بھی ایک مستقل حکم ہوا۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب اسے "رُوح خدا کا حکم ہے" سے تعبیر کریں تو ہمارے خیال میں مفہوم میں کچھ فرق نہیں پڑیگا۔

۲۔ رُوح سے متعلق سوال کرنے والے؟

استفسار کرنے والے یہودی یا مشرکینِ مکہ تھے۔ جنہوں نے یہودیوں ہی کے کہنے پر حضورِ اکرمؐ سے چند سوالات پُوچھے۔ انہی میں سے ایک سوال رُوح کے متعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح سے متعلق سوال کے جواب میں جو یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ "تمہیں رُوح کے متعلق بہت کم علم دیا گیا ہے" تو یہ خطاب نہ یہود سے مختص ہے نہ مشرکینِ مکہ سے بلکہ اُس کے مخاطب تمام بنی نوعِ انسان ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، عالم ہوں یا جاہل، نبی ہوں یا ولی کیونکہ انسان میں جتنی علمی استعداد ودیعت کی گئی ہے۔ وہ رُوح کی کُنہ کو سمجھنے سے قاصر و عاجز ہے۔

۳۔ رُوح کی قسمیں۔

رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رُوحِ حیوانی جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ جب تک گردشِ خون برقرار ہے یہ رُوح بھی موجود ہوگی۔ گردش رُک جائے تو رُوح ختم ہو جاتی یا نکل جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تک یہ رُوح موجود ہو گردشِ خون برقرار رہتی ہے۔ اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی ہے۔

دُوسری قسم رُوحِ نفسانی ہے جسے روحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو دورانِ خواب سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصّہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواسِ خمسہ کی کارکردگی میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوّتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر غل غپاڑہ ہو یا کوئی دُوسرا آدمی سوتے ہوئے آدمی کو آوازیں دے کر جگائے تو یہ رُوحِ نفسانی دوبارہ جسم میں لَوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں قسم کی رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جُز ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لُطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشّاش بشّاش نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب

میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چیخنے چلانے لگتا ہے اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر خواب میں کہیں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بھی بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاگنے کے بعد خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے باہمی تعلق کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دُوسری خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یُوں سمجھئے کہ ایک شخص سویا ہُوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کسی دوسرے شخص نے اُسے سوتے میں قتل کر دیا تو رُوحِ نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ یہ اب دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر دورانِ خواب اگر رُوحِ نفسانی کو اللہ تعالیٰ قبض کر لیں تو رُوحِ حیوانی کی کارگزاری یعنی دورانِ خون خود بخود ختم ہو جائے گا اور انسان پر موت واقع ہو جائے گی۔ ارشادِ باری ہے :

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى" (الزمر: ۴۲)

"اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت اُن کی رُوحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں اُن کی رُوحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔"

آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جو ہر دم انسان کے بدن میں موجود رہتی ہے اور دوسری وہ جو خواب میں جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ جاگتے میں یہ دونوں قسم کی روحیں یا رُوح کے ہر دو حصّے انسان میں موجود رہتے ہیں۔

۳۔ رُوح کو قبض کرنا یا موت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے۔ اگر وہ خواب کے دوران رُوحِ نفسانی کو قبض کرے تو بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔

۴۔ بیداری کی حالت پُوری زندگی اور خواب کی حالت نیم زندگی کی کیفیت ہے جس میں کچھ صفات زندگی کی پائی جاتی ہیں اور کچھ موت کی۔ گویا یہ کیفیت موت و حیات کے درمیان برزخی حالت کی مظہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دنیا اور آخرت کی زندگی کے درمیان قبر کی زندگی برزخی زندگی ہوتی

ہے۔ فرق صرف یہ ہے، قبری زندگی میں موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ اور خواب کی زندگی میں زندگی کے۔ خواب کے دوران چونکہ کچھ خصوصیات موت کی بھی پائی جاتی ہیں اسی لیے حضور اکرمؐ نے اسے موت سے تشبیہ دی ہے۔

۴۔ تناسخ یا آواگون۔

تناسخ یا آواگون کا نظریہ خالص ہندوانہ فلسفہ ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض متصوفین یا مسلمانوں کے بعض فرقے جو اس عقیدہ کو درست سمجھتے ہیں۔ اور قرآنی آیات سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے متعلق اس سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ باطنیت اور رہبانیت نے جن اسلامی عقائد و نظریات پر یلغار کر کے اُن کا حلیہ بگاڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

احادیث صحیحہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جسے امام بخاریؒ بھی قرآن کی آیت:

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ؕ (۲۶/۸۷) "اور اے اللہ مجھے قیامت کے دِن رسوا نہ کرنا"

کے تحت کتاب التفسیر میں لائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ کو رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تو حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "یا اللہ! تیرا وعدہ ہے، تو قیامت کے دن مجھے رُسوا نہ کرے گا۔ اور میری اس سے زیادہ رُسوائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرا باپ اس طرح رُسوا ہو رہا ہے" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "اپنے پاؤں کے نیچے دیکھئے"! اتنی دیر میں آپؑ کے باپ (آذر یا تارخ) کی شکل تبدیل کر دی جائے گی۔ آپؑ دیکھیں گے تو آپ کو نجاست میں لتھڑا ہوا ایک بجو نظر آئے گا۔ جسے فرشتے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ تاکہ کوئی شخص یہ معلوم نہ کر سکے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو رُسوائی سے بچا لیا جائے گا۔ اور ان کے باپ کو بھی اس کے گناہوں کی قرار واقعی سزا مل جائے گی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

۱۔ قیامت کے روز ارواح کو جو اجسام عطا کیے جائیں گے وہ وہی مانوس انسانی بدن ہوں گے، جنھیں دوسرے لوگ پہچانتے ہوں گے۔

۲۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو بجو کا جسم دیا گیا تو محض ایک استثنائی صورت ہے۔ جس کے لیے ایک ٹھوس بنیاد ہے۔

۳- اللہ کا قانون جزا و سزا اتنا مستحکم اور ہمہ گیر ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے باپ کو بھی عذابِ الٰہی سے بچا نہیں سکیں گے تو کسی دوسرے پیر فقیر یا نبی ولی کی کیا مجال ہے کہ وہ قیامت کے روز کسی کی نجات کا دم بھرے۔

اِسی طرح قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا ایک یہ منظر پیش کیا ہے:

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝ یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ (الصّٰفّٰت : ۵۱ - ۵۵)

اُن میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ (دُنیا میں) میرا ایک ساتھی تھا (جو) کہتا تھا کہ بھلا تم بھی (ایسی باتیں) باور کرنے والوں میں سے ہو؟ بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہوگئے تو کیا ہم پر گرفت ہوسکے گی؛ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کیا تم اس سے باخبر ہونا چاہتے ہو؟ پھر جب جھانکے گا تو اس (میرے ساتھی) کو دوزخ کے وسط میں دیکھے گا؟

اِن آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت انسان بھی اسی مانوس شکل کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ جو اس نے دنیا میں دیکھی تھی۔ گویا قیامت کے دن وہی بدن اور وہی شکلیں ارواح کو دی جائیں گی جو اس دنیا میں تھیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس دن ایک دُوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ارواح کو وہی اجسام اور وہی شکلیں عطا کی جائیں جو دُنیا میں تھیں۔

اب دیکھئے نصوصِ قرآنیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے دن تک مومنوں کی ارواح علّیین میں اور کافروں کی ارواح سجّین میں مقید رہتی ہیں ان کو کوئی نیا جسم عطا نہیں کیا جاتا۔ اور قیامت کے دن جو جسم عطا کیا جائے گا وہ وہی ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ تو بتلائیے کہ اب تناسخ کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؛ جس کی رُو سے مرنے کے بعد رُوح کو کبھی کسی گدھے کا جسم عطا کیا جاتا ہے کبھی مکھی مچھر یا پسّو کا اور کبھی کتّے اور سؤر وغیرہ کا۔

یہاں ضمناً ایک دو باتیں اور بھی سامنے آگئیں۔ جن میں سے ایک تو شہدا کی زندگی کے متعلق ہے۔ جن کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھیں مُردہ مت کہو، وہ مُردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اور حدیث

ہیں ہے کہ شہدا کی رُوحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چہچہاتی پھرتی ہیں۔ اور دوسری بات سماعِ موتیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔

رُوح کا سفر:

رُوح کا سفر اس طرح ہے کہ انسان جب بطنِ مادر میں لوتھڑا کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں رُوح داخل کی جاتی ہے۔ پھر وہ بطنِ مادر سے باہر آتا ہے۔ اب یہ بچہ کہلاتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ پھر اس پر موت آتی ہے یعنی قبر کی زندگی یا برزخی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد قیامت کے دن ارواح کو اجسام مہیا کیے جائیں گے اور یہی پوری زندگی ہوگی۔

شہدا کی زندگی:

اب دیکھئے زندگی کے اس سفر کی منازل میں شارٹ کٹ تو ہو سکتا ہے لیکن واپسی ناممکن ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک بچہ جوان ہونے یا بوڑھا ہونے سے پہلے ہی مر جائے یا شکمِ مادر میں ہی مر جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے یا بچہ شکمِ مادر میں واپس چلا جائے۔

شہدار کی فضیلت یہ ہے کہ ان کی قبر کی زندگی یا برزخی جسے عام اصطلاح میں بھی موت کہا جاتا ہے اور قرآن نے بھی اسے موت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ حذف کر دی گئی ہے۔ اور شہید مرنے کے بعد فوراً جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ ایک استثنائی صورت ہے۔ تو جس طرح یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ اسی طرح ان کے اجسام (سبز پرندوں کی شکل) بھی ایک استثنائی صورت ہے۔ ورنہ قیامت کے دن انھیں پھر وہ جسم عطا کئے جائیں گے جو اس دنیا میں تھے اور لوگ انھیں پہچانیں گے۔

سماعِ موتیٰ:

اور سماعِ موتیٰ اس لیے ناممکن ہے کہ جو روحیں جسم چھوڑ کر علیین یا سجین میں مقید ہیں۔ وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور نہ ہی شہدار کی وہ رُوحیں دنیا میں واپس آسکتی ہیں جو براہِ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے کہ جنت میں شہدار سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "تمھاری کوئی آرزو ہو تو بتلاؤ تاکہ وہ پوری کر دی جائے" تو شہدار جواب دیں گے کہ "ہمیں تو یہاں سب نعمتیں میسر ہیں، اور ہمیں کیا درکار ہو سکتا ہے" اللہ تعالیٰ کے بار بار اصرار پر شہدار یہ جواب دیں گے۔ کہ "پھر ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ ہم پھر شہید ہو کر مزید بلند درجات حاصل کر سکیں" تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "یہ بات میرے قانون کے خلاف ہے۔ تم دنیا میں واپس

نہیں جا سکتے۔ کوئی اور بات ہو تو بتلائیے؟" پھر شہداء جواب دیں گے کہ "پھر کم از کم دنیا والوں کو اور ہمارے عزیز و اقارب کو اس بات سے مطلع کر دیا جائے کہ ہم یہاں کس قدر خوش ہیں۔ اور ہر طرح کے انعامات سے متمتع ہو رہے ہیں؟" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ "ہاں میں یہ اطلاع کیے دیتا ہوں"۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(آل عمران : ۱۶۹-۱۷۰)

جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انھیں مرے ہوئے نہ سمجھنا بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور انھیں اپنے رب کے ہاں سے رزق مل رہا ہے۔ جو کچھ خدا نے اُن کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اُس میں وہ خوش ہیں۔ اور ان لوگوں کو جو (اس دنیا میں) اُن کے پیچھے ہیں اور مر کر ان میں شامل نہیں ہوئے ہیں، خوشخبری دیتے ہیں کہ اُن پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمناک ہیں"

غور فرمائیے کہ جنت میں شہداء کی آزاد روحیں بھی نہ اپنے عزیز و اقارب کو دنیا میں آکر کوئی پیغام سنا سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی قبر پہ پکارنے والوں کو کچھ کہہ سکتی ہیں۔ تو وہ روحیں جو سجّین اور علّیّین میں مقید ہیں، وہ کیسے دنیا میں واپس آکر دنیا والوں کی بات سنتی یا اُن سے ہم کلام ہو سکتی ہیں؟

۵۔ تناسخ اور رُوحِ کلّی۔

تناسخ کی طرح روحِ کلّی کا نظریہ بھی ہندوانہ فلسفہ سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو رہبانیت کے راستہ سے اسلام میں داخل ہوا۔ اور جس کا وحیٔ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہندو فلسفہ روح کی مختلف کیفیتوں کو آتما، مہاتما اور پرماتما سے تعبیر کرتا ہے۔ آتما وہ روح ہے جو عام انسانوں کے جسم میں داخل ہے۔ جب یہ روح مختلف جونوں سے سفر کرتی ہوئی پاک و پوتر ہو جاتی ہے۔ تو کسی بزرگ و برتر انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور مہا آتما کہلاتی ہے۔ مہاتما گاندھی یا مہاتما بدھ اُن کے ہاں ایسی ہی ہستیاں ہیں۔ پھر جب یہ روحیں مزید پاکیزگی حاصل کرتی ہیں تو پرماتما (خدا یا پرمیشور) کی روح کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ اب دیکھئے مسلمان صوفی بھی واصل بحق، واصل باللہ اور فنا فی اللہ جیسی اصطلاحات وضع کرکے اسی ہندوانہ عقیدہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وحی الٰہی

اس سلسلہ میں روح کی منازل یوں بیان فرماتی ہے :

"کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ٥"

(البقرۃ : ۲۸)

تم اللہ سے کیسے کفر کرتے ہو ۔ تم مردہ تھے تو اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر وہی تمھیں مارتا ہے۔ پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ۔

عام اصطلاح اور اسی طرح شرعی اصطلاح میں بھی روح اور بدن کے اتصال کا نام زندگی اور اُن کے انفصال کو نام موت ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو روح پیدا ہو چکی ہے اس پر موت نہیں آنے گی۔ اب آیت بالا میں پہلی کیفیت یہ ہے کہ روح تو پیدا ہو چکی ہے لیکن اُسے ابھی جسم نہیں ملا۔ دوسری کیفیت شکم مادر میں جنین میں روح داخل ہونے سے لے کر موت تک ہے۔ تیسری کیفیت موت سے لے کر قیامت کے دن تک ہے۔ چوتھی کیفیت قیامت سے متعلق ہے۔ جب ارواح کو اجسام مہیا کیے جائیں گے۔ اور پانچویں خدا کے حضور حاضری دینے سے متعلق ہے۔

اب دیکھیے یہاں نہ تو روحِ کلی کا کہیں ذکر ہے۔ نہ اس میں مدغم ہونے کا، نہ تحلیل کا یعنی نہ تو کوئی روح خدا کی ذات یا فلسفہ کی زبان میں روحِ کلی میں شامل ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی خدا کسی انسان کے جسم میں حلول کر سکتا ہے۔ آخری منزل "اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" کے الفاظ اِن سب نظریات کو مردود قرار دیتے ہیں۔ اگر روحِ کلی میں اتصال کا نظریہ صحیح ہوتا تو "اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" کے بجائے "فِیْہِ یُلْحَقُوْنَ" یا اِس قسم کے الفاظ ہونے چاہئیں تھے۔

اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث بھی قابلِ غور ہیں :

(۱) عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَیُکَلِّمُہٗ رَبُّہٗ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَہٗ تَرْجُمَانٌ وَّلَا حِجَابٌ یَحْجُبُہٗ ۔

(بخاری۔ کتاب التوحید)

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر شخص سے اللہ تعالیٰ ضرور بات کریں گے وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں نہ کوئی مترجم ہو گا اور نہ کوئی حجاب جو آڑ بن سکے

(۲) عَنْ جَرِیْرٍ قَالَ کُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْ نَظَرَ اِلَی الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ قَالَ "اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ

حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں آپ نے چودھویں

كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ
(بخاری، کتاب التوحید)

رات کے چاند کو دیکھا تو فرمایا تم ضرور (مرنے کے بعد آخرت میں) اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو اور تمھیں کوئی اڑچن محسوس نہ ہوگی۔

پھر اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

"وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (۷۵: ۲۲-۲۳)

اس دن بہت سے چہرے پُررونق ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محوِ دیدار ہوں گے۔

اب دیکھیے اگر روحِ کلی میں اتّصال کا نظریہ صحیح ہو تو یہ دیدارِ الٰہی، یہ خدا سے ہم کلامی اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے حساب کتاب لینا، آخر یہ باتیں کس کھاتے میں جائیں گی؟ اِن سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ روحِ کلّی میں اتّصال کا نظریہ گیان دھیان کا نظریہ تو ہو سکتا ہے۔ وحیِ الٰہی کلّی طور پر اس سے ابا کرتی ہے۔

۶۔ حالتِ نزع کی رنج و راحت۔

جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث موجود ضرور ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس انسان کی روح دنیا اور اس کے متعلقات کی محبت میں جس قدر زیادہ پھنسی ہوئی ہوگی، حالتِ نزع میں اس کی جان یا روح اتنی ہی مشکل سے نکلے گی۔ اور جس شخص کی روح دنیا اور اس کے متعلقات میں رہ کر بھی اس سے بے نیاز رہی ہے وہ روح آسانی سے نکلے گی۔ اس بات کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک پہلو سے متعلق ہے۔ اس میں بھی مستثنیات موجود ہیں۔ خود حضورِ اکرمؐ نے حالتِ نزع میں کافی تکلیف اٹھائی۔ حالانکہ آپؐ زہد کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ حالتِ نزع میں آپؐ نے جو تکلیف دیکھی اسے دیکھ کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس نظریہ کو مشکوک قرار دیا تھا۔ اس تکلیف کی وجہ خواہ زہر کے اثرات کا مرض الموت میں دوبارہ عود کر آنا ہو یا کوئی دوسری وجہ ہو۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ آپؐ نے مرض الموت میں کافی تکلیف اٹھائی تھی۔

۷۔ بد روحیں۔

بدارواح سے مراد وہ روحیں ہیں جو وحیِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتیں۔ خواہ یہ روحیں انسانوں سے تعلق رکھتی ہوں جو برزخ میں مقید ہیں یا ابھی اسی دنیا میں ہیں۔ یا شیطانی روحیں یا جنوں کی روحیں جو اسی دنیا میں موجود ہیں۔ انسانوں کو گمراہ بھی کرتی ہیں اور تکلیف بھی پہنچاتی ہیں۔ قرآن

میں ہے:

"وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا" (الجن: ٦)

"اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے۔ اس سے اُن کی سرکشی اور بڑھ گئی تھی"

اور حضرت رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو بیت الخلاء میں جانے سے پیشتر یہ دعا سکھلائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"

"اے اللہ میں بدروحوں سے خواہ وہ نر ہوں یا مادہ، تیری پناہ میں آتا ہوں"

بدروحوں سے بچنے کا یہی طریقہ مسنون ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ مختلف قسم کے چلّے اور ریاضتیں کر کے بشش قفل اور ہفت ہیکل وغیرہ وضع کر کے ایسی روحوں سے اپنی مرضی کے کام لیتے۔ لوگوں کو ضرر پہنچانے یا اُن کے ضرر سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ سب مشرکانہ افعال ہیں۔ ایسی روحوں کے ضرر سے بچنے کے لیے معوذتین کا وِرد، سورۂ جن کی تلاوت، نظرِ بد کی دعا، یا بیت الخلاء سے جانے سے پہلے کی دعا وغیرہ، جو باتیں مسنون ہیں وہ تو عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ لیکن جن اعمال، وظائف، اوراد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اُن کے استعمال سے بہرحال پرہیز ضروری ہے۔

هٰذَا مَا عِنْدِيْ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ!

—— ❦ ——



رُوح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ

(یہ مقالہ محدّث صفر، ربیع الاوّل اور ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوا۔)

کچھ عرصہ قبل راقم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں رُوح سے متعلق چند امور زیر بحث آئے تھے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مجھے دو حضرات کی طرف سے یہ سوال نامے موصول ہوئے ہیں۔ پہلے سائل جناب عبدالقادر صاحب سومرو کراچی سے لکھتے ہیں کہ:

"مکرمی جناب کیلانی صاحب،

آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ:

"اور سماعِ موتیٰ اس لیے ناممکن ہے کہ جو رُوحیں جسم چھوڑ کر "علیین" یا "سجین" میں مقید ہیں وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور نہ ہی شہداء کی وہ رُوحیں دنیا میں واپس آسکتی ہیں جو براہِ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں!"

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ سماعِ موتیٰ ناممکن ہے۔

۲۔ مرنے کے بعد ارواح کا دوبارہ جسموں میں آنا ناممکن ہے۔

اور پورا قرآن و احادیثِ صحیحہ اس پر گواہ ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس جسم میں رُوح نہیں آسکتی۔ لیکن دوسری طرف مولانا سیف الرحمٰن الفلاح نے اپنے ایک مضمون میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"ہجرت کرنے والی مومن عورت کی دعا سے اللہ نے اس کے بیٹے کو دوبارہ زندہ کیا۔"

پھر جب ہم نے شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" کا مطالعہ کیا تو عقل حیران رہ گئی کہ صرف یہی نہیں کہ مُردہ دوبارہ زندہ ہوگیا، بلکہ اس نے ماوی کے

ساتھ کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد جب غور سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو ذہن بڑی اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ ان نظریات اور عقائد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن ان کتابوں میں تو انھوں نے اِن تمام باتوں کو مان کر سند دے دی جو آج کفر و شرک کی بنیاد ہیں۔

شیخ الاسلام دونوں کتابوں "اقتضاء الصراط المستقیم" اور "کتاب الوسیلہ" میں لکھتے ہیں:

۱۔ "جب کوئی شخص کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے، جسے وہ دُنیا میں جانتا تھا اور اس پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رُوح اس میں لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے"۔

(کتاب الوسیلہ صفحہ ۲۳۳، اردو ترجمہ اسلامی اکادمی لاہور۔ اقتضاء الصراط المستقیم، اردو ترجمہ مجلس نشریاتِ اسلامی کراچی)

۲۔ "اس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضورؐ پر سلام کا جواب سُنا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب نے واقعہ حرہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی ہوئی اذان سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ہو سکتا ہے"۔

(اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۱۶۱۔ اردو ترجمہ)

۳۔ "بہر حال میّت کا قرآن اور دوسری آوازیں سُننا تو حق ہے، لیکن مرنے کے بعد عمل پر اُسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن مُردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۶۱)

محترم! یہ چند سوالات آپ کو بھیج رہا ہوں، اس پر کتاب اللہ اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں تبصرہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام!

دوسرے سائل محمد احسان الحق صاحب یارو خیل میانوالی (حال اسلام آباد) سے لکھتے ہیں کہ:

"محترم! ایک عرصہ سے میرے ذہن میں مسئلہ عذابِ قبر کے متعلق اُلجھن اور خلفشار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عذابِ قبر حق ہے۔ قبر منازلِ آخرت میں سے ایک بلکہ پہلی منزل ہے۔ اس منزل سے کامیاب گزرنے والا آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور جو یہاں پکڑا گیا اُس کی آخرت کی بھی خیر نہیں۔ عذابِ قبر کے بارے میں مجھے جو اشکال ہے اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زندگی موت کی ضد ہے۔ جب روح جسم میں پڑتی ہے تو جِلا ملتی ہے اور جب نکال لی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر یوم البعث کو یہ رُوح دوبارہ جسم میں آئے گی تو انسان

زندہ ہوگا۔ دُنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی کے درمیان ایک مرحلہ ہے، جسے برزخ کہتے ہیں، اسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ زندگیاں تو از رُوئے قرآن دو ہیں اور موتیں بھی دو، تو یہ برزخی زندگی کیا ہے؟

۲۔ عذابِ قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق رُوح سے ہے؟ بعض مشائخ سے سنا ہے کہ رُوح کا عکس جسم پر رہتا ہے لہٰذا جسم کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو حساب کا کیا مطلب؟

۳۔ "فَيُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ" کا کیا مفہوم ہے؟ نصوصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ جب رُوح اور جسم ملیں گے تو انسان فوراً اُٹھ کھڑا ہوگا۔ جیسے سورۂ یٰسٓ میں ہے: "وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ"

۴۔ کُتبِ حدیث میں ہے کہ جب مُردے کو دفن کرکے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ اُن کے جُوتوں کی آواز سُن رہا ہوتا ہے کہ اُس کے پاس منکر اور نکیر آجاتے ہیں۔ جب رُوح جسم سے نکل جاتی ہے تو حواسِ خمسہ بھی جاتے رہتے ہیں پھر وہ کس طرح سُنتا ہے؟ قرآن بھی تو کہتا ہے: "اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا"

۵۔ مولانا محمد اسمٰعیل سلفیؒ اپنی تصنیف "الآیات القویۃ علی ان حیوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ لیست بدنیویۃ" میں ص۴۵ پر بحوالہ "کتاب الروح" (از ابنِ قیم) فرماتے ہیں:

"برزخ کا تعلق۔ اس میں گو علیحدگی ہو جاتی ہے لیکن تجرّدِ کلی نہیں ہوتا بلکہ سلام کے جواب کے لیے اُسے لُوٹایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دنیوی زندگی نہیں ہوتی جو اُسے مرنے سے پہلے حاصل تھی۔"

۶۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن بندہ پر (جب وہ ٹھیک جواب دیتا ہے تو) قبر حدِ نظر تک فراخ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کافر پر قبر تنگ ہو جاتی ہے اُسے بھینچ لیتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک صحابی رسولؐ پر قبر تنگ ہو گئی؟

۷۔ جب از رُوئے قرآن مُردہ نہیں سُن سکتا (وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ) تو صیغہ حاضر اور حرفِ ندا کے ساتھ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ" کیوں کہتے ہیں؟

۸۔ کتاب الروح (از ابنِ قیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

محترم! نصوصِ صریحہ کی روشنی میں میرے اِن اشکالات کا تدارک فرمائیے!

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ!

الجواب بعون الوہاب

رُوح کے متعلق بحث ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ خلّاقِ عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ:

"وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا" (بنی اسرائیل: ۸۵)

"اور تمہیں روح سے متعلق تھوڑا ہی علم عطا کیا گیا ہے"

جس کا واضح مطلب ہے کہ رُوح کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا انسان کے لیے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن انسان کی عادت ہے کہ جس بات سے متعلق اس پر بندش عائد کی جائے، وہ اس بات کی کرید وتفتیش میں دوسری باتوں سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک مسئلہ تقدیر کا تھا جس پر بحث کرنے سے صراحتًا روکا گیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر حضرت انسان نے اپنی تحقیق وتفتیش سے وہ وہ گل کھلائے کہ اسی مسئلہ میں اختلاف کی بناء پر امتِ مسلمہ کے دو فرقے پیدا ہو کر آپس میں متحارب ہوگئے۔ رُوح کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اس پر بھی جن جن علماء نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تفاصیل میں بہت اختلاف واقع ہوا۔ محولہ بالا مضمون میں میں نے روح سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ تفصیل پیشِ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زندگی اور موت کے چار مراحل:

جسم اور رُوح کے انفصال کا نام موت اور اتصال کا نام زندگی ہے۔ عام ضابطہ الٰہی کے مطابق دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ پہلے موت ہے پھر زندگی، پھر موت ہے پھر زندگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرة : ۲۸)

"تم خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو، اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندہ کیا۔ پھر تمھیں مارتا ہے پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔"

اور قیامت کے دن کفار بھی یہی اقرار کریں گے کہ:

"قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ؟" (المؤمن : ۱۱)

"کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم کو دوبارہ موت دی اور دوبارہ زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو کیا اب (جہنم کے عذاب سے) نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟"

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے زندگی سے پہلے موت کا ذکر کیا ہے زندگی کی طرح موت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو زندگی سے پہلے پیدا کی گئی۔ گویا موت محض عدم یا کسی سلبی چیز کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات سے پہلے پیدا کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" (الملک : ۲)

"اسی نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔"

پہلا مرحلہ موت ہے

روحوں کی پیدائش کب ہوئی؟ پہلا مرحلہ موت ہے اور اس سے مراد وہ دور ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام روحوں کو بھی پیدا فرمایا، جو اس کی پشت سے تا قیامت پیدا ہونے والی تھیں۔ "عہدِ الست" اسی دور سے متعلق ہے۔ (الاعراف ۱۷۲) اور یہ دور روح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکمِ مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ روح اگرچہ ایک زندہ و متحرک اور عقل و شعور رکھنے والی چیز ہے۔ لیکن چونکہ ابھی اس روح کو جسم نہیں ملا جو اعمال کے صدور کا ذریعہ ہے، لہٰذا اس دور کو موت سے تعبیر کیا گیا۔

اسی دور کے متعلق دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ"

(الاعراف: ۱۱)

"ہم نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے :

۱۔ تمھاری یہ تخلیق فرشتوں کے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے پیشتر وقوع پذیر ہو چکی تھی۔

۲۔ اس تخلیق کے وقت تمھاری صورتیں بھی بنا دی گئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ روح بھی شکل وصورت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید ان احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں مذکور ہے کہ فرشتے جب کسی نیک مسلمان کی روح قبض کرتے ہیں، تو اس روح کو ریشمی لباس میں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس روح کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روح کی شکل وصورت بھی بالکل وہی ہوتی ہے جو اُس کو ملنے والے جسم کی ہوتی ہے یا ہوگی۔ یہی تو روحیں بھی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور اس روح کی قالب میں مثال یوں سمجھئے جیسے زیتون کے درخت میں روغنِ زیتون یا کوئلہ میں آگ یا جلنے والی گیس۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے روح کی تخلیق اور اس کو شکل وصورت عطا کرنے کے باوجود اس دور کو عام محاورہ کے مطابق موت کے زمانہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی موت کی تخلیق کا مفہوم ہے۔

اب ان چاروں مراحل کی کیفیت اس طرح ہوئی کہ :

(۱) پیدائشِ روح سے لے کر اُس روح کو مادرِ شکم میں داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) شکمِ مادر میں جسم میں روح کے داخل ہونے سے لے کر موت تک کا عرصہ۔ اسے زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) موت سے لے کر قیامت کو دوبارہ اجسام میں روح کے داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۴) قیامت کو دوبارہ جی اُٹھنے کے بعد لا متناہی مدت۔ اس عرصہ کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اب دیکھئے کہ ان چاروں ادوار میں عدم یا فنا اگر ہے تو جسم کو ہے۔ روح جب سے پیدا

ہوئی۔ اُس کے معدوم یا فنا ہونے کا کوئی مرحلہ پیش نہیں آیا۔ جب روح اکیلی ہوتی یا رہ جاتی ہے تو اُسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو اُسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دُوسرا مرحلہ :۔ دُنیوی زندگی

اس مرحلہ میں رُوح بدن میں داخل رہتی ہے۔ یعنی جنین میں رُوح کے داخل ہونے یا جان پڑنے سے لے کر رُوح کے جسم سے نکل جانے یا مرنے تک کا عرصہ دنیوی زندگی کہلاتا ہے۔ زندگی کہنے کا اصل سبب تو یہی ہے کہ اس عرصہ میں رُوح و بدن کا کلی اتصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتصال کلی کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ گویا اس موت و حیات کے قانون میں استثنار کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ تاکہ برزخ کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

استثنائی صورتیں :

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام ضابطہ یا قانونِ قدرت یا سُنّت اللہ یا عادت عامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے مجبور و بے بس نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام قوانینِ فطرت یا قدرت کے خلاف گاہے گاہے اس کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور یہ بات اس آگ کی فطرت میں داخل ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت آگ کو یہ حکم دے کہ فلاں شخص کے حق میں "ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا" تو آگ کو اپنی اصلی فطرت چھوڑ کر اللہ کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ چھری کا کام کاٹنا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے حکم سے چھری کی اس خاصیّت کو سلب بھی کر سکتے ہیں۔ مائعات کا یہ کام ہے کہ افتراق کے بعد اس کے اجزار فوراً مِل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ دریا کو یہ حکم دے کہ پھٹ کر بہاڑ کے تودوں کی طرح رُک جا اور درمیان میں کشادہ راستہ بنا دے۔ تو دریا کو اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا صرف ایک قانون ایسا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور یہ قانون قوموں کے عروج و زوال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم بدکرداری کی انتہائی پستیوں کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ خواہ یہ تباہی جلد ہو یا بدیر۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو سُنَّةُ اللهِ کہا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں چار مختلف مقامات پر ذکر کر کے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ اس "سُنّت اللہ" میں کوئی تغیر و تبدل یا لچک نہیں ہے۔

۱ - احیائے موتیٰ یا اسی دنیوی زندگی میں مُردوں کا زندہ ہونا :

رہا موت و حیات کا قانون، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی استثنائی صورتیں قرآنِ کریم سے واضح طور پر ثابت ہیں :

۱۔ حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو "قُمْ بِاِذْنِ اللہِ" کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے۔

۲۔ حضرت عزیرؑ کا ایک اُجڑی ہوئی اور ویران شدہ بستی پر گزر ہوا تو کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ اس مُردہ بستی کو کیسے زندہ کرے گا ؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پورے سو سال کے لیے موت دے دی۔ پھر زندہ کر کے پوچھا "اب بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ یہاں پڑے رہے ہو؟" کہنے لگے کہ "یہی کوئی دن آدھ دن کی بات ہوگی" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "نہیں بلکہ تم تو سو سال موت کی حالت میں پڑے رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو تمھارے سواری کے گدھے کے پنجر کے سوا اور کوئی چیز رہ گئی ؟ دیکھو اب ہم تمھارے سامنے اس پنجر کو کیوں کر گوشت پوست پہنا کر کے اُسے پھر سے زندہ کیے دیتے ہیں" (البقرۃ : ۲۵۹)

۳۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ سب مشتبہ لوگ ایک دوسرے پر الزام دھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ پھر اس مذبوح گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ تو یہ لاش خود اپنے قاتل کا پتہ بتلائے گی۔ چنانچہ جب اس لاش پر مذبوح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارا گیا۔ تو مُردہ زندہ ہو گیا۔ اُس نے باتیں کیں اور اپنے قاتل کا پتہ بھی بتلا دیا۔ (البقرۃ : ۷۲)

۴۔ حضرت موسیٰؑ جب تورات لے کر کوہِ طور سے بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے، تو اس بدسرشت قوم نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے اُتری ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اسے اللہ کی طرف سے اُترتے تو دیکھا نہیں۔ پھر یہ یقین کیسے ہو؟ موسیٰؑ نے قوم کے اس بے ہودہ اعتراض سے نجات کی یہی راہ دیکھی کہ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں۔ چنانچہ وحی الٰہی کے مطابق اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو چُنا اور کوہِ طور پر لے گئے۔ وہاں جا کر جب ان ستر آدمیوں نے اپنے مطالبہ کو دُہرایا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور تورات کے اترنے کا منظر دیکھنے پر اصرار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک کڑک بھیج کر اُن سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب حضرت موسیٰؑ پھر اللہ سے التجا کرنے لگے۔ بارِ الٰہی! ان بے وقوفوں کی اس خواہش پر تُو نے انھیں مار دیا۔ اب میں کیسے واپس جاؤں اور قوم کو کیا کہوں ؟ تو

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ" (البقرۃ : ۵۶)

"پھر ہم نے تمھیں تمھاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا"

نیز دیکھیے : الاعراف : ۱۵۵

۵۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض اطمینانِ قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کیا کہ "اے میرے پروردگار تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے ؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں فرمایا کہ یوں کرو کہ چار پرندے لے کر اُن سے خُوب مانوس ہو جاؤ تاکہ اُن کی شکل و صورت کو خوب پہچان سکو۔ پھر اُن کو ذبح کر کے اُن سب کا گوشت اچھی طرح ملا دو۔ پھر اُسے مِلے جُلے گوشت کو چار حصّوں میں تقسیم کرو اور ہر حصّہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر واپس آکر انھیں ایک ایک کر کے پکارو تو وہی پرند تمھارے پاس دَوڑتا ہُوا آتے گا جسے تم پکارو گے۔ اسی طرح چاروں پرندے تمھارے بُلانے کی ترتیب کے مطابق تمھارے پاس حاضر ہوتے جائیں گے" (البقرہ : ۲۶۰)

۶۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں لوگ جہاد کے لیے نکل تو کھڑے ہُوئے لیکن دشمن کے مقابلہ اور موت کے ڈر سے اُن کی جان گویا پہلے ہی نکل رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہیں موت دے دی، کہ جس بات سے ڈرتے ہو اس کا تو ابھی مزہ چکھو۔ پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو صرف عبرت دلانا مقصود تھا۔ لہٰذا انھیں پھر سے زندہ کر دیا۔ (البقرہ : ۲۴۳)

یہ تمام واقعات قرآنِ کریم میں بصراحت موجود ہیں۔ ہم نے کسی واقعہ کی تشریح و تفسیر اپنی طرف سے بیان نہیں کی بلکہ صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو عام قانونِ الٰہی یہی ہے کہ ہر شخص کو دوبار زندگی اور دوبار موت سے دوچار ہونا ہے۔ مگر کسی کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت بھی مقدر ہو سکتی ہے۔ گو ایسے واقعات شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں، تاہم ان کے امکان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جو لوگ ایسے واقعات کی تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ کی جاری و ساری قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔

ب۔ نیم زندگی (خواب) یا برزخی موت :

اب دیکھیے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر انسان کو موت کا ہلکا سا نقشہ دکھلا دیا گیا ہے اور یہ موت نیند کی حالت ہے۔ جسے ہم برزخی موت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نیند کو موت کی بہن قرار دیا ہے۔ نیز سونے کے بعد جاگنے پر جو دُعا سکھلائی۔ یعنی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔ اس دعا میں نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ نشور کا لفظ بعث بعد الموت کے لیے آتا ہے۔

برزخ کا لغوی مفہوم برزخ کے معنی بالعموم پردہ یا آڑ کر لئے جاتے ہیں۔ جبکہ عربی زبان میں پردہ کے لیے اور بھی بہت سے لفظ موجود ہیں مثلاً ستر، حجاب، غطاء، غلف، اکنۃ وغیرہ۔ اور ان سب الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق موجود ہوتا ہے۔ برزخ دراصل دو مختلف یا متضاد چیزوں کے درمیان ایک ایسی تیسری چیز کا نام ہے۔ جس میں پہلی دونوں اشیاء کے ملے جلے اوصاف پائے جاتے ہیں اور وہ آڑ کا کام بھی دے۔ خواہ یہ اوصاف برابر برابر ہوں یا کسی ایک چیز کے کم اور دوسری کے زیادہ۔ جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعراف برزخ ہے۔ جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برزخ ہے۔ جو بڑھتا اور شاخیں تو نباتات کی طرح پھیلاتا ہے۔ مگر نوع کے لحاظ سے پتھر ہے اور جمادات میں شامل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ میٹھے اور کھاری پانی کے درمیان ایک برزخ کی رو پیدا کر دیتا ہے جسے قرآنِ کریم میں برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اسی لحاظ سے برزخ ہے کہ اس میں زندگی اور موت کے ملے جلے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں غالب اثرات زندگی کے ہی ہوتے ہیں موت کے نہیں۔

برزخی موت یا نیند اسی نیند کے معاملہ پر غور کرنے سے رُوح کی بحث بھی شروع ہو جاتی ہے سب علماء اور اطباء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں: ایک تو رُوح حیوانی ہے جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ (اسی رُوح کو بعض حضرات نے نفس زیریں سے بھی تعبیر کیا ہے) جب تک گردشِ خون برقرار ہو یہ رُوح بھی موجود ہوگی اور اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی ہے۔

رُوحِ انسانی یا نفس دوسری قسم رُوحِ نفسانی ہے۔ جسے نفس بالا یا رُوحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو خواب میں سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواسِ خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوتِ سامعہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں اگر غل غپاڑہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے ہوئے آدمی کو آواز دے کر جگائے تو یہ رُوحِ نفسانی دوبارہ فوراً اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس رُوحِ نفسانی کو اپنے قالب سے عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی قالب اس رُوحِ نفسانی کی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب بھی نفس کو مخاطب کیا ہے تو اس

سے مراد ہمیشہ یہی نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جُزو ہوتے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چیخنے چلانے لگتا ہے۔ اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں خواب میں مار پڑے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنھیں انسان جاگنے کے بعد خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

رُوح سے متعلق چند حقائق

خواب سے ہر انسان کو بکثرت واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس خواب سے بھی چند ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن کے ثبوت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۱۔ خواب میں اس رُوحِ نفسانی کی شکل وصورت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے بستر پر پڑے ہوئے (سوتے ہوئے) اس کے قالب کی ہوتی ہے۔ اور خواب کے دوران جب رُوحیں آپس میں ملتی ہیں تو اس شکل وصورت کی ہم آہنگی کے واسطہ سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ ان ہی رُوحوں کی آپس میں ملاقات ہو جو اس دُنیا میں زندہ کہلاتے ہیں۔ یہ ملاقات اُن لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس جہان سے رحلت کر چکے یا مر چکے ہیں۔ زندہ کی رُوح مُردہ کی رُوح سے بھی ملاقات کر سکتی ہے اور اس کے برعکس بھی۔

۳۔ خواب میں جو واقعات رُوح کو پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کے بیشتر اثرات سے اس رُوح کا مادی قالب بے بہرہ رہتا ہے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ لیکن جب جاگتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے۔ البتہ کچھ نہ کچھ واقعات ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن سے انسان کا مادی قالب بھی متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم عام قاعدہ یہی ہے کہ مادی قالب رُوحِ نفسانی سے خواب کے دوران پیش آمدہ واقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ خواب میں رُوح راحت و اَلم یعنی ثواب وعذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ حتّٰی کہ مر بھی جاتی

ہے اور کبھی تو خواب میں زندہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی بیداری پر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب میں تو مر گیا تھا مگر حقیقتاً زندہ ہے۔

یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان مشاہدات و تجربات کی وجوہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالےٰ نے یُوں فرمائی کہ: "وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا"

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دُوسری قسم کی رُوح از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یُوں سمجھئے کہ ایک شخص سویا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اُسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو رُوحِ نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ اب یہ دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اُسے وہیں قبض کر لے گا۔ اسی کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی رُوحِ نفسانی کو خواب میں قبض کر لیں تو بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی حادثہ یا بیماری کے مر جائے گا۔ ارشادِ باری ہے:

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى"

(الزمر: ۴۲)

"اللہ تعالیٰ موت کے وقت کسی شخص کی رُوح کو قبض کر لیتا ہے اور اس شخص کی رُوح کو بھی جو خواب میں ہے اور ابھی مرا نہیں۔ پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے اُن کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو جو (خواب دیکھ رہی ہیں) ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے"

آیتِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے قوی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ رُوح جو کسی حالت میں بھی بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور یہ رُوحِ حیوانی یا نفسِ زیریں ہے۔ دُوسری وہ رُوح جو خواب میں بدن کو چھوڑ کر سیر کرتی پھرتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ رُوح نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی کہلاتی ہے۔ اسی رُوح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتے ہیں۔ اور اسی رُوح کو دوام ہے۔

۲۔ رُوحِ حیوانی یا نفسِ زیریں کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس رُوح کا کوئی وجود

ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رُوح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا بلکہ جسد، میت لاش یا نعش کہلاتا ہے۔

۲۔ بیداری کی حالت میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں انسانی جسم میں موجود رہتی ہیں۔ اوسطاً ہر انسان اپنی زندگی کا تیسرا حصّہ وقت سو کر گزارتا ہے۔ گویا اس دنیوی زندگی کا تیسرا حصّہ وقت برزخی موت ہے۔ پھر اس دنیوی زندگی میں اس برزخی موت کی حالت میں بھی زندگی کے آثار موت کے آثار سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیا وی زندگی میں تقریباً بارھواں حِصّہ وقت انسان پر موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ: موت سے لے کر حشر تک عرصۂ موت

چونکہ اس عرصہ میں رُوح کو بدن میسر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ عرصۂ موت ہے۔ مگر دنیوی زندگی کی طرح اس عرصہ موت میں بھی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ عذابِ قبر

اب دیکھئے جس طرح انسان دنیوی زندگی میں موت کے اثرات سے دوچار ہوتا ہے، بعینہٖ اسی طرح عرصہ موت (مرنے کے وقت سے لے کر روزِ قیامت تک کی موت) میں زندگی کے اثرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علماء نے کئی طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ رُوحیں سجّین اور علّیین میں ہوتی ہیں۔ تاہم ان رُوحوں کا ہلکا سا تعلق اپنی اپنی قبروں سے قائم رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان روحوں کا عکس قبر پر بھی پڑتا ہے بعض دُوسرے علماء نے اس حقیقت کو یُوں ادا کیا کہ اس عرصہ موت میں رُوح اور بدن کا انفصال کُلّی نہیں ہوتا۔ گویا رُوح اور بدن کا تعلق قائم تو مستقل طور پر رہتا ہے مگر یہ تعلق بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

عذابِ قبر کی حقیقت مجھے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ کہ:

(۱) اس عرصہ موت میں رُوح و بدن میں کلّی طور پر انفصال ہو جاتا ہے مگر جس طرح دنیوی زندگی میں بحالتِ خواب کبھی کبھار رُوح بدن کو چھوڑ جاتی ہے۔ بعینہٖ اس عرصۂ موت میں کبھی کبھی رُوح اپنے بدن سے آملتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا وی زندگی میں

انسان سونے یا آرام کرنے کے لیے کسی حد تک خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن خواب اور اس میں رُوح کے واردات اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جبکہ اس برزخی عالم میں کچھ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ سب کچھ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ گویا رُوح و بدن کا یہ تعلق صرف ہلکا اور کمزور ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر مستقل ہوتا ہے اور اضطراری بھی۔

۲۔ پھر جس طرح، ایک دن رات یا ۲۴ گھنٹہ کے عرصہ میں انسان رات کو یا کسی وقت دن کو سوتا ہے تو خواب کی صورت میں اُس کی رُوح بدن چھوڑ جاتی ہے، اسی طرح اس عرصۂ موت میں دن میں ایک دو بار اپنے قالب یا قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

۳۔ پھر جس طرح خواب کی حالت میں رُوح کے بدن کو چھوڑنے کے وقت بھی حقیقتاً حیات کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں روح کی بدن سے ملاقات کے دوران بھی موت کے آثار غالب رہتے ہیں۔

۴۔ نیز جس طرح خواب میں رُوح راحت و اَلم سے دوچار ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے اثرات بدن پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصۂ موت میں رُوح کو عذاب و ثواب ہوتا ہی ہے، تاہم اس ملاقات کے دوران اس کے اثرات جسم یا اس کے ذرّات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور یہی عذاب و ثواب کی حقیقت ہے۔

قرآن اور عذابِ قبر اب دیکھیے امام بخاریؒ نے قرآن کی درج ذیل آیت سے عذابِ قبر کا استشہاد کیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ" (المومن: ۴۶)

"وہ صبح و شام آگ (آتشِ جہنّم) پر پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی تو (ہم حکم دیں گے کہ) آلِ فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کے الفاظ ہمارے اسی موجودہ نظامِ شمسی کے حساب سے ہیں۔ دن بھر میں ایک دو بار عذاب پر پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ رُوح اور بدن کا اتصال مسلسل نہیں ہے۔ ورنہ فرعون جیسے ظالم اور کافر کو تو قبر میں عذاب مسلسل ہی دیا جانا چاہیے تھا۔

۲۔ انھیں صرف عذاب پر پیش کیا جاتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح خواب میں

راحت و اَلَم کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے اسی طرح قبر میں عذاب و ثواب کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے۔ یعنی عذاب و ثواب کا اثر قیامت (زندگی) کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

۳۔ البتہ قیامت کے دن ان لوگوں کو فی الحقیقت آتشِ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ زندگی کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں رُوح و بدن کا تعلق مسلسل اور مستقل طور پر قائم رہے گا لہٰذا عذاب و ثواب شدید بھی ہو گا اور مستقل بھی۔

دوسری آیت جس سے امام بخاریؒ نے عذابِ قبر کا استشہاد کیا ہے۔ وہ استشہاد کی حد تک تو درست ہے مگر اس سے مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

"وَلَوْ تَرٰىٓ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ" (الانعام ۹۳)

"کاش تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی"

یہ آیت درج کرنے کے بعد امام بخاری لفظ ھُوْن کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قَالَ اَبُوْعَبْدُ اللّٰہِ الْھُوْنُ ھُوَ الْھَوَانُ وَالْھَوْنُ الرِّفْقُ۔

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ما جاء فی عذاب القبر)

"امام بخاری نے کہا کہ ھُوْن کا معنی ھَوَان یعنی ذلت اور رُسوائی ہے۔ اور ھَوْن کا معنی نرمی اور ملائمت ہے"

آیت بالا اور امام صاحب کے اجتہاد سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عذاب (و ثواب) قبر مرنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ "الیوم" کے لفظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عذاب بھی گو ذلت و رسوائی کا ہو گا۔ تاہم اشد العذاب یا عذابِ عظیم کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہو گا۔

ہمارے اس خیال کی تائید بہت سی احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ مومن کے پاس قبر میں فرشتے آتے ہیں، تو پہلے اس پر دوزخ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم دُنیا میں بداعمالیاں کرتے تو تمہارا ٹھکانا یہ دوزخ ہوتی۔ پھر اس پر جنت کو پیش کر کے کہا جاتا ہے

کہ چونکہ تم نے دُنیا میں اپنی زندگی احکامِ الٰہی کی اطاعت میں بسر کی ہے۔ لہٰذا اب تمھارا ٹھکانا جنت ہوگا۔ پھر جنت سے ایک روزن اس کی قبر میں کھول دیا جاتا ہے۔ اور کافر سے معاملہ بعینہٖ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قبر اور حدث انسان کو جب قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے جسم کو مٹی یا کیڑے کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک مدت بعد بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات قبروں کے نشان تک بھی مٹ جاتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رُوح کا یہ جزئی اتصال آخر کون سے بدن سے ہوتا ہے۔ اور جب قبر کے نشان تک مٹ کر اس پر بازار بن چکے ہیں یا کھیتی کاشت کی جا چکی ہو تو وہ قبر ہے کون سی جس میں عذاب ہوتا ہے؟

اس سے آگے چلئے بعض لوگ اپنے مُردوں کو دفن ہی نہیں کرتے بلکہ لاش کو جلا دیتے ہیں پھر اُس کی راکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی موت یُوں واقع ہوتی ہے کہ انھیں درندے پھاڑ کھاتے ہیں۔ اور میّت اس درندے کا جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ بعض لوگ پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں تو آبی حیوانات کی خوراک بن کر اُن کا جزوِ بدن بن جاتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی قبر یا بدن ہے۔ جس کے ساتھ اس عرصہ موت میں رُوح کے اتصال کا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

اب اس سے بھی آگے بڑھیے کہ جو درندے یا آبی جانور کسی میّت کی قبر بنے ہیں۔ وہ بھی بالآخر مر کر مٹی میں مل جائیں گے۔ تو قبر یا بدن والی آخر کونسی بات رہ جاتی ہے جس سے رُوح کا اتصال ہو؟ جب ہم یہ سوچتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کی لاش مٹی میں مل کر مٹی کے ذرّات میں ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کلیہ میں اگر استثنار ہے تو صرف یہ کہ انبیاؑ قبروں ہی میں دفن ہوتے ہیں۔ اور اُن کے اجساد کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ جیسا کہ احادیثِ صریحہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ ایسے صلحاء بھی اس ضمن میں آسکتے ہیں جن کے اجساد کو کھانا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے مگر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاؑ کے اجساد کو زمین کیوں نہیں کھاتی؟ یہ ایک الگ بحث ہے جو خصائص انبیاؑ سے تعلق رکھتی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی صورت جب تک اس کا جسد قبر میں بحال رہتا ہے، یا پھر قبر کے نشانات قائم رہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قبر کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ" (فاطر : ۲۲)

"اے محمدؐ! آپ اُن لوگوں کو سُنا نہیں سکتے جو قبروں میں ہیں"

اور دُوسری حالت آخری حالت ہے۔ جبکہ نہ تو قبر کا نشان باقی رہ جاتا ہے اور نہ جسم کا، بلکہ وہ مٹی میں مِل کر مٹی بن جاتا ہے۔ تو اس حالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے "جدث" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ" (یٰسٓ ۵۱)

"پھر جب صُور میں پھونکا جائے گا تو لوگ اپنی اپنی اجداث سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے"

گویا قیامت کے برپا ہونے کے وقت نفخہ ثانی پھونکا جائے گا جس کا اثر یہ ہوگا کہ مٹی میں مِلے ہُوئے ذرّات فوراً متحرک ہوکر آپس میں مل کر جسم کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پھر ان اجسام کی رُوحیں اُن میں مستقل طور پر داخل ہو جائیں گی۔ پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہتے ہُوئے میدانِ محشر کی طرف دوڑتے ہُوئے پہنچ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

عذابِ قبر کا عقلی ثبوت

اب رہی یہ بات کہ جدث کی صُورت میں تُرُوح کا اتصال (اگرچہ وہ کبھی کبھار اور کمزور سا ہوتا ہے) ممکن بھی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ احادیثِ صحیحہ سے اور قرآن سے بھی عذاب وثوابِ قبر کا دوام ثابت ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی یہ ممکن ہے۔ کیونکہ جسم کے کسی ادنیٰ سے حصّے یا ذرّے پر تکلیف سے رُوح متاثر ہو جاتی ہے۔ اور اب تو سائنس کے جدید انکشافات نے اس مسئلہ کو اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جسم کی ساخت میں خلیات کا کردار اور اُن کا بناؤ بگاڑ۔ نیز فضا میں ازل سے پیدا شدہ انسانی اور غیر انسانی آوازوں کا محفوظ ہونا اور ان آوازوں کو الگ الگ کرنے کا امکان ایسی باتیں ہیں جو جدث سے بعث بعدالموت کے امکان کو ٹھوس ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور اس بات کا بھی کہ ان ذرّات سے رُوح کے اتصال کا امکان، ممکن ہے۔

عذابِ قبر کا تعلق رُوح اور بدن دونوں سے ہے

بدن یا جسم میں اگرچہ عقل وشعور اور ارادہ واختیار نہیں ہوتا لیکن چونکہ

لے قبر اور جدث کا یہ لغوی فرق شاید لغت کی کسی کتاب سے نہ مل سکے گا۔ یہ جو کچھ فرق میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم کے طرزِ بیان کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔

وہ ایک "آلہ کار" کی حیثیت سے رُوح کے نیک و بداعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہٰذا اس برزخی زندگی میں وہ بھی اپنی موجودگی کی مناسبت سے عذاب و ثواب میں شریک ہوتا ہے۔ اس برزخی زندگی میں رُوح تو مستقل طور پر زندہ رہتی ہے مگر بدن کو یہ پائیداری حاصل نہیں۔ لہٰذا اس عذاب و ثواب کا بیشتر حصّہ رُوح ہی کے حصّہ میں آتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ عرصہ موت ہے جس میں زندگی کے آثار جیسے کچھ بھی ہوں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی زندگی میں خواب جیسی نیم زندگی ہونے کے باوجود اس عرصہ کا نام زندگی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں زندگی کے آثار زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ مرحلہ۲ (دنیوی زندگی) میں موت (نیند) اور مرحلہ۳ میں برزخی زندگی کے وجود کی طرف رسول اللہؐ کے درج ذیل ارشاد میں پوری طرح صراحت موجود ہے۔ فرمایا:

"اَلنَّاسُ نِيَامٌ اِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا"

"لوگ سوتے ہوتے ہیں، جب مریں گے تو اُن کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے"

برزخی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے جتنی اس دنیا میں خواب کی ہے۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح دُکھ سُکھ سے دوچار ہوتی ہے، اور یہ سمجھتی ہے کہ وہ فی الواقعہ ان واردات سے دوچار ہے لیکن اس کے باوجود واقعات کی خارجی دنیا میں اس کا کچھ وجود نہیں ہوتا اسی طرح برزخی کیفیت میں جہاں تک رُوح کے عذاب ثواب کا تعلق ہے، وہ فی الواقعہ مکمل طور پر اس سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن خارجی دُنیا میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اب دیکھیے انسان دو ہی طرح کے ہیں، ایک مومن، دُوسرے کافر۔ مومن کے لیے قبر فراخ کر دی جاتی ہے اور کافر کے لیے قبر اتنی تنگ کر دی جاتی ہے کہ میّت کی ہڈیاں ایک دُوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور یہ واقعات میّت کی تدفین کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس میّت کی قبر کو اکھاڑ کر دیکھیں گے تو قبر کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

پھر جس طرح خواب میں بعض اوقات رُوح کے علاوہ بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ کے عذاب و ثواب میں بھی بعض دفعہ بدن پر اثر ہو جانا ممکن ہے۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبھی رُوح و بدن کا اتصال ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ مدّت "موت" ہے۔

آزمائش اور حساب کا فرق اب رہی یہ بات کہ اگر عذاب و ثواب قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے تو پھر آخرت میں اور کونسا حساب لینا باقی رہ جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں حساب نہیں لیا جاتا۔ صرف سرسری جانچ کی جاتی ہے۔ منکر نکیر آتے ہیں اور

تین بنیادی باتوں کے متعلق تین موٹے موٹے سوال پوچھتے ہیں۔ یہ گویا سرسری سا زبانی امتحان ہوتا ہے۔ جس سے میت کو دُنیا میں اپنی کارکردگی اور آئندہ زندگی میں ان اعمال کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں میت کو خوشی یا غمی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ قبر میں عذاب و ثواب کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ مومن کو جنت دکھلا دی جاتی اور اُسے جنت کی خوشخبری دے کر نہ صرف یہ کہ اُس کے ذہنی اطمینان وانبساط کا سامان مہیا کیا جاتا ہے بلکہ جنت کی کچھ تھوڑی بہت نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے۔ اور ان نعمتوں کی نسبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اس عرصہ موت کو زندگی سے نسبت ہے۔

۲۔ کافروں کو پہلے جنت دکھلا کر پھر دوزخ پیش کی جاتی ہے تاکہ ان کو مزید حسرت و یاس ہو۔ اور حصہ رسدی عذاب بھی پہنچایا جاتا ہے۔

۳۔ گنہگار مسلمان کو عذاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔ اور وہ بعث بعد الموت کے جنت میں جانے کے قابل بن سکے۔ اور اگر وہ زیادہ گنہگار ہے تو آخرت میں اس گناہوں کے بدلہ میں اس حد تک تخفیف کر دی جاتی ہے، جس حد تک وہ عذاب قبر میں بھگت چکا ہے۔

اور حساب کا معاملہ آزمائش سے سخت اور شدید تر ہے۔ کیونکہ حساب اللہ تعالیٰ خود لیں گے دنیوی زندگی کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ کر حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہو گی۔ اعمال کیلئے میزان ہو گا۔ شہادتیں مہیا کی جائیں گی۔ اور یہ سب میدانِ محشر میں اس چوتھے مرحلہ میں ہو گا جس کا نام بعث بعد الممات یا اخروی زندگی ہے۔ جب رُوح اور بدن متصل ہوں گے اور عذاب و ثواب کا اثر شدید، ہمہ گیر اور دائمی ہو گا۔

پھر اس حساب یا عدالتی انصاف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو محض اللہ کے حضور پیشی اور سرسری پوچھ گچھ ہے۔ جو انصاف کے بجائے اللہ کی رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ لوگوں سے بالعموم اسی قسم کا حساب لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ رعائتی نمبر دے کر بھی پاس کرتے جائیں گے۔ اور حساب کی یہی قسم "حِسابًا یَّسِیرًا" کہلاتی ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کو دُعا سکھلائی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن بھی انصاف پر اُتر آئیں۔ اور ہر شخص کے اعمال کو ہی جنت میں داخلہ کا سبب قرار دیا جائے تو شاید کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے ڈھانپ لے۔

(ب) سماعِ موتیٰ

سماعِ موتیٰ کا مسئلہ عذابِ قبر یا رُوح کی حقیقت کی طرح محض ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے سماعِ موتیٰ کے تمام امکانی پہلوؤں کو پوری قوت سے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات قابلِ غور ہیں:

۱۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (النحل ۲۰، ۲۱)

"اور جنھیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

۲۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ (فاطر: ۲۲)

"زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تو جس کو چاہے سُنا سکتا ہے لیکن (اے محمدؐ) تم ان لوگوں کو سُنا نہیں سکتے، جو قبروں میں مدفون ہیں۔"

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

۳۔ "وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ (الاحقاف: ۵، ۶)

"اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب نہ دے سکے، بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روزِ قیامت) اکٹھے کیے جائیں گے تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔"

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ غائب یا فوت شدہ لوگوں کو پکارنا ان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ بالفاظِ دیگر شرک ہے۔

۲۔ غائب یا فوت شدہ لوگ کسی کی پکار کا جواب دینا تو درکنار اُن کی بات سن بھی نہیں سکتے۔

۳۔ قبروں میں پڑے لوگ زندہ نہیں ہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں۔ انھیں اپنی ذات کے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے۔

۴۔ البتہ ایک استثنائی صُورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مُردوں کو سنوا سکتا ہے اس کے علاوہ اُن کے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

استثنائی صُورت

اَب دیکھئے یہ استثنائی صورت وہی ہے جسے ہم دنیوی زندگی میں خواب کی مثال میں پیش کر چکے ہیں۔ خواب میں بھی رُوحیں اپنی مرضی سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ پھر جس طرح خواب میں رُوحیں آپس میں ایک دُوسرے سے بات چیت کرتی اور ایک دُوسرے کی سنتی بھی ہیں۔ لیکن سویا ہوا آدمی پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سُن سکتا۔ کیونکہ عالمِ خواب اَور عالم ہے اور عالمِ دُنیا اور عالم۔ اسی طرح مُردہ لوگ جو عالمِ دُنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم (عالمِ برزخ یا عالمِ مثال) میں رہتے ہیں، وہ دُنیا کے لوگوں کی باتیں کیونکر سُن سکتے ہیں؟ عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ مُردے کسی کی بات سُن نہیں سکتے۔

استثنائی صورتوں کے نتائج

اب دیکھئے کہ:

(۱) دو بار زندگی اَور دو بار مَوت ایک عام ضابطہ الٰہی ہے مگر مرحلہ ۲ میں مُردوں کا زندہ ہونا استثنار کی صورت ہے۔ جسے چند عقل پرستوں یا نیچر پرستوں کے علاوہ سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ اسی مرحلہ ۲ یا دنیوی زندگی میں دُوسری استثنائی صورت خواب یا نیم موت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے اَور چونکہ یہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ خواب میں چونکہ موت کے اثرات بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ نیند کا عرصہ بھی حیات ہی میں شمار ہوتا ہے۔

۳۔ مرحلہ ۳ یعنی مرنے سے یوم البعث کے عرصہ کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس میں بھی زندگی کے ہلکے سے آثار پائے جاتے ہیں۔ قبر کے عذاب کا ثبوت قرآن سے بھی ملتا ہے۔ اور احادیثِ صحیحہ سے بھی واضح طور پر ثابت ہے۔ اس استثنائی صورت کو بھی سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ منکرینِ حدیث کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے قرآن کی آیات کی تاویل کر لی۔ اور احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس استثنائی صُورت کا

انکار کر دیا۔

۴۔ مرحلہ ۳ میں دوسری استثنائی صورت سماعِ موتٰی ہے۔ اس کے متعلق عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے۔ اور استثنائی صُورت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مُردوں کو سُنا سکتا ہے۔ پھر کچھ احادیثِ صحیحہ بھی ایسی ہیں۔ جن میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ مُردے سُن سکتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں امت میں اختلاف واقع ہوا۔ اور عجب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرنِ اول میں بھی اختلاف موجود تھا۔ مثلاً حضرت قتادہؒ اور حضرت عائشہؓ تو سماعِ موتٰی کے منکر تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتٰی کے قائل تھے۔ البتہ یہ بات قرمدد ہے کہ صحابہؓ میں اختلاف سننے کی حد تک تھا۔ یہ بات قطعاً مختلف فیہ نہیں تھی کہ وہ سن کر جواب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر آج یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ سماعِ موتٰی کے قائلین صرف یہی نہیں کہتے کہ مُردے سُن سکتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مُردے اہلِ دنیا کی بات سُن کر جواب بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں سائل کی حاجت برآری کرنے کی قدرت اور تصرّف بھی رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ گروہِ صوفیہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا پیری مریدی کا سلسلہ ان اعتقادات کے بغیر چلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم سردست مُردوں کے جواب دینے اور حاجت برآری کرنے کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سماعِ موتٰی کی حد تک ان قائلین کے دلائل کا جائزہ پیش کرتے ہیں :

سماعِ موتٰی کے قائلین کا طریقِ استدلال

(۱) **قرآنی آیات کی تاویل** قرآن مجید چونکہ سماعِ موتٰی کی سخت اور کلی تردید کرتا ہے اس لیے یہ حضرات ایسی تمام آیات کی تاویل کر جاتے ہیں۔ جو سماعِ موتٰی کی تردید کرتی ہیں۔ مثلاً :

(ا) موتٰی سے مراد حقیقی مُردے نہیں بلکہ دل کے مردہ یا کافر لوگ ہیں اور "ان کو سُنا نہیں سکتے" کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں راہِ راست پر نہیں لا سکتے اور اللہ کے سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی اُنھیں راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

(ب) جن بے جان ہستیوں کے پکارنے کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے مراد بزرگ نہیں بلکہ وہ اصنام یا شمس و قمر اور مظاہرِ قدرت ہیں۔ جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ یہی وہ

چیزیں ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں۔ اور بے جان اور بے شعور ہیں۔ رہے بزرگ تو ان کی زندگی میں جب اُن کی پرستش ہی نہیں ہوئی تو ان آیات سے یہ بزرگ کیسے مُراد لئے جا سکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

تاویلات کا جائزہ

یہ تو واضح ہے کہ آج تک عبادت یا تو بُتوں کی ہوتی رہی ہے یا مظاہرِ قدرت کی جیسے شمس و قمر، ہوا، پانی، آگ اور درخت وغیرہ یا جنوں اور فرشتوں کی یا پھر فوت شدہ بزرگوں کی۔ یہ بزرگ گو اپنی زندگی میں اپنی عبادت سے منع کرتے رہے مگر جب لوگوں نے اُن کی وفات کے بعد اُن کی قبروں پہ پکارنا شروع کیا تو اُن کی اسی پکار کو قرآن نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف پوجا پاٹ نہیں ہوتا بلکہ کسی کو نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے کے لیے پکارنا ہی عین عبادت اور اُس میں شامل ہے۔ اور بالعموم انہی دو باتوں کے لیے کسی کو پکارا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ :

۱۔ آیت ۱ میں "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ" کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر، اور الفاظ "بعث بعد الموت" کا اطلاق بتوں یا دیگر مظاہرِ قدرت پہ نہیں ہو سکتا۔ اب باقی صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

۲۔ آیت ۲ میں گو موتیٰ سے مراد مُردہ ضمیر کافر بھی لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس آیت یا سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر یہ مجازی معانی اختیار کئے جائیں۔

۳۔ آیت ۳ میں "وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ" کے الفاظ کو جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دُعا سُن سکتے ہیں۔ اور "كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً" کے الفاظ بتوں اور مظاہرِ قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اِن بے جان اشیاء کی نہ اس دُنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ ہے نہ آخرت میں اُن کی دشمنی کا کچھ نقصان۔ بلکہ اِن چیزوں کا تو آخرت میں کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔ اب صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

(۲) احادیث صحیحہ

احادیث صحیحہ کے ملخص کے طور پہ چار باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ نبی اکرمؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا۔

۲۔ قلیبِ بدر کا واقعہ۔

۳۔ مُردے کا تدفین کے بعد واپس جانے والوں کے قدموں کی چاپ سُننا۔ اور

۴۔ قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو "السلام علیکم دار قوم مومنین" وغیرہ کہنے کا ارشادِ نبویؐ۔ ان باتوں میں سماعِ موتیٰ کا احتمال موجود ہے۔ گویا احادیثِ صحیحہ چونکہ قائلین اور منکرینِ سماع کے درمیان مشترک ہیں۔ لہٰذا ان کا ذکر ہم منکرینِ سماعِ موتیٰ کے دلائل میں پیش کریں گے۔

(۳) تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث ایسی احادیث میں سماعِ موتیٰ کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اور یہی احادیث دراصل سماعِ موتیٰ کے قائلین کے لیے رُکنِ شدید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ احادیث تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابلِ احتجاج نہیں ہوتیں۔ نہ اُن سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا بیکار اور خارج از بحث ہے۔ اس طرح کی ایک دو احادیث کا ذکر آئندہ چل کر آئے گا۔ جو ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود بہت مشہور ہیں۔

(۴) بزرگوں کے اقوال بزرگوں کے اقوال نے تو سماعِ موتیٰ کی بنیاد پر ایک قصرِ عظیم تیار کر دیا ہے۔ یہ بزرگ مُردوں کو یوں زندہ کرتے ہیں کہ حضرت علیٰؑ کا معجزہ اُن کی کرامات کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مُردوں کو زندہ کرنے کا امکان ہے مگر ان حضرات نے تو اس امکان کو اتنا عام کیا کہ عام ضابطہ اور استثناء میں کوئی فرق ہی نہ چھوڑا۔ مولانا مودودی صاحبؒ نے کہا تھا کہ مسلمان کی عادت سی بن گئی ہے کہ جہاں انھیں سُوئی کے ناکے جتنی گنجائش ملی وہاں سے وہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال ان لوگوں کی بھی ہے۔ سماعِ موتیٰ، حاجت برآری اور تصرفاتِ امور میں اُن کا دخل اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم تر نہیں ہوتا۔ اگرچہ زبان سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت کے متبع ہیں۔ یہ مباحث اس موقع پر خارج از بحث ہیں۔ سرِدست ہم یہی عرض کرنا چاہتے ہیں، کہ بزرگوں کے ان اقوال اور خوابوں کو ان کے بعض معتقدین بھی حجت نہیں سمجھتے۔ تو ان کو زیرِ بحث لانا بالکل بیکار ہے۔

منکرینِ سماعِ موتیٰ اور انکے دلائل

۱۔ قرآن قرآن میں مذکورہ بالا تین آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے

سلہ ان کا ذکر ہم نے اپنی تصنیف "شریعت و طریقت" میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔

سماعِ موتیٰ کا ردّ ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہیں گے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مرحلہ ۳ یعنی برزخی زندگی میں مُردوں کے متعلق عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ وہ سُن نہیں سکتے۔ اس طرح کی مزید آیات کا اندراج طوالت کا باعث ہوگا۔ مقصد برآری کے لیے یہی تین آیات کافی ہیں، جو درج کی جا چکی ہیں۔

۲- احادیثِ صحیحہ

(۱) مقتولینِ بدر تلیبِ بدر یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقتولینِ بدر کے خطاب کا واقعہ تقریباً تمام کتبِ صحاح میں موجود ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف صحیح بخاری سے تین روایات نقل کریں گے (ایک حدیث کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ دوسری کے حضرت قتادہؒ اور تیسری کی حضرت عائشہؓ) تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ امام بخاریؒ نے یہ احادیث کتاب المغازی (غزوہ بدر) میں درج فرمائی ہیں۔ اور "کتاب الجنائز باب ما جاء فی عذاب القبر" میں بھی۔

(ا) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

"اِطَّلَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَهْلِ الْقَلِيْبِ فَقَالَ" وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ كُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَقِيْلَ لَهُ اَتَدْعُوْ اَمْوَاتًا۔ قَالَ: مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَا يُجِيْبُوْنَ"

"جو کافر بدر کے دن اندھے کنویں میں ڈال دیئے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر جھانکا اور فرمایا "تمہارے مالک نے جو سچا وعدہ تم سے کیا تھا وہ تم نے پالیا" لوگوں نے عرض کیا "آپ مُردوں کو پکارتے ہیں؟" فرمایا "تم کچھ اُن سے زیادہ نہیں سنتے۔ البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے"۔

(ب) حضرت قتادہ، انس سے اور وہ ابو طلحہ انصاری سے یہی واقعہ روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

قَالَ قَتَادَةُ: اَحْيَاهُمُ اللهُ حَتّٰى اَسْمَعَهُمْ قَوْلَهٗ تَوْبِيْخًا وَّتَصْغِيْرًا وَّنِقْمَةً وَّحَسْرَةً وَّنَدَمًا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی، ابواب غزوہ بدر)

"قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ کہا کہ اللہ نے اس وقت اُن مُردوں کو جلا دیا

تھا، اُن کو زجر و توبیخ کرنے، ذلیل کرنے، بدلہ لینے، افسوس دلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے۔"

(ج) حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم یا اس اجتہاد کا ردّ کرتے ہوئے فرمایا کہ عبداللہ بھول گئے۔ (نسائی۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر)

اور خود اس واقعہ کے متعلق فرمایا:

"قَالَتْ: إِنَّمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهُمْ لَيَعْلَمُونَ الْآنَ أَنَّ مَا كُنْتُ أَقُولُ لَهُمْ حَقٌّ وَقَدْ قَالَ اللهُ تَعَالَى إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ" (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ما جاء فی عذاب القبر)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کافروں کو صرف یہ کہا تھا کہ: مَیں جو ان سے کہا کرتا تھا اب ان کو معلوم ہو گا کہ وہ سچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ رُوم میں) فرمایا کہ اے پیغمبر تو مُردوں کو سنا نہیں سکتا۔"

ان ہر سہ احادیث سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔ گو انھوں نے بھی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ تاہم اُن کا یہ عمل تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہؐ پر، حضرت ابو بکرؓ پر اور اپنے باپ حضرت عمرؓ پر سلام کہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔

۲۔ گو آپؓ سماعِ موتیٰ کو درست سمجھتے تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ "وہ جواب نہیں دے سکتے" گویا اُن کے نزدیک بھی یہ سلام، سلامِ دعاء یا "سلامتی کی دعا" تھا، سلامِ تحیۃ نہ تھا، جس کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہ اس واقعہ کو نبی اکرمؐ کا معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کافروں کی زجر و توبیخ اور حسرت و ندامت دلانے کے لیے کہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی رُوحیں لوٹا دیں، تاکہ وہ یہ الفاظ سُن لیں۔ یا اللہ نے براہِ راست اُن کی رُوحوں تک یہ الفاظ پہنچا دیئے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سماعِ موتیٰ کی اس حد تک انکاری ہیں کہ آپؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم کا ردّ بھی کیا۔ آپؓ بھی اس واقعہ کو ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اُن کے خیال میں

ان مردوں کو سنا دینا اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی توجیہ وہی بیان فرمائی جو حضرت قتادہ نے فرمائی۔

حضرت عائشہ رضؓ کا تفقہ

اب دیکھئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک تہجد گزار، زاہد، متقی اور صالح انسان ضرور تھے۔ مگر تفقہ میں انھیں وہ مقام حاصل نہ تھا جو حضرت عائشہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ ترمذی کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

"عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: مَا أَشْكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا" (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب مناقب ازواج النبیؐ)

"ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ جب بھی ہم اصحاب رسول اللہ میں کسی حدیث کے متعلق اشکال پیدا ہوتا تو ہم اُسے حضرت عائشہؓ سے حل کرانے کو آتے تو ہمیشہ آپؓ کے پاس اس حدیث کا علم پایا کرتے۔"

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تفقہ کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے ان کے بارے میں خلیفہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

"وَاللهِ مَا أَرَدْتُ بِهٰذَا، وَيْحَكَ كَيْفَ أَسْتَخْلِفُ رَجُلًا عَجِزَ عَنْ طَلَاقِ امْرَأَتِهِ" (تاریخ الخلفاء)

"خدا کی قسم! میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ تجھ پر افسوس! کیا میں ایسے شخص کو اپنا جانشین بنا جاؤں، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔"

اس تقابل سے نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شان کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ آپؓ کو خود رسولؐ اللہ نے "صالح آدمی" کہا اور تہجد پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اُن کی یہ فضیلت اپنے مقام پر ہے لیکن جہاں تک قوتِ اجتہاد کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کا مقام اُن سے بہت بلند تھا۔

گویا حضرت عائشہؓ کے اجتہاد کے مطابق رسول اللہ کے یہ کلمات زجر و توبیخ اور حسرت و

افسوس دلانے کے طور پر کہے۔ جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دریا میں تیرنے سے منع کرتا ہے۔ مگر بیٹا اس کام سے باز نہ آئے اور دریا میں ڈوب کر مر جائے۔ پھر اس کی لاش باپ کے سامنے آئے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تجھے نہ کہا تھا کہ یہ کام نہ کرنا ورنہ مر جاؤ گے۔ گویا یہ کلمات زجر و توبیخ کے طور پر رسول اللہ نے کہے اور اعجاز کے طور پر اللہ نے یہ کلمات اِن مقتولینِ بدر کو سُنوا دیئے۔

۲۔ اہلِ قبور کو السلام علیکم کہنا

احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ "مسلمان جب قبرستان جائیں تو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ" کہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جو سماعِ موتیٰ کے قائلین کی طرف سے بڑے شدومد سے پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی خاص واقعہ سے بھی متعلق نہیں۔ سماعِ موتیٰ کا انکار کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ یہ سلام، سلامتی کی دُعا ہے، سلامِ تحیۃ ہے ہی نہیں جو سُنا جا سکتا ہو اور جس کا جواب دینا فرض ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی توقف تھا۔ اس کی مثال بھی یونہی سمجھیے جیسے تشہد میں رسولؐ اللہ پر سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا کوئی خط لکھنے والا ابتدا میں "السلام علیکم" سے خطاب کرتا ہے۔ اس سلام کا فوری جواب دینا تو درکنار، جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی جواب آجاتا ہے کبھی نہیں آتا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب رسولؐ اللہ پر بھیجا ہوا سلام بھی آپؐ خود نہیں سُنتے بلکہ فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام مسلمانوں پر بھیجا ہوا سلام از خود اُن تک پہنچ جائے اور وہ اُسے سُن سکیں۔ ایسے سلام بھی بذریعہ خدا تعالیٰ ہی اُن تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ جوتوں کی چاپ

دوسرا واقعہ جس سے سماعِ موتیٰ کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "جب میت کو اس کے عزیز و اقارب دفن کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو مُردہ ان کے جوتوں کی چاپ سُنتا ہے۔"

یہ واقعہ بھی بہ تکرار احادیثِ صحاح میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے اسے "کتاب الجنائز باب ما جاء فی عذاب القبر" میں دو مقامات پر اس طرح درج فرمایا ہے:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا مَاتَ عَبْدٌ وُّضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ تَوَلّٰی عَنْہُ اَصْحَابُہٗ اِنَّہٗ لَیَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِھِمْ اَتَاہُ مَلَکَانِ فَیُقْعِدَانِہٖ فَیَقُوْلَانِ ...." (الحدیث)

"رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص مرتا ہے اور اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اُسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو وہ اُن کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے بٹھلا دیتے ہیں پھر کہتے ہیں"..... (الحدیث)

اب مشکل یہ ہے کہ مُردہ کے جوتوں کی چاپ سُننے کا واقعہ بخاری کے علاوہ جو دوسری کُتبِ صحاح میں جہاں بھی مذکور ہے تو ساتھ ہی منکر نکیر کے آنے اور سوال و جواب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منکر نکیر کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اُس کی رُوح علیین یا سجین سے لوٹا کر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے، تاکہ وہ سوالوں کے جواب دے سکے۔ اب یہ سوال و جواب کا واقعہ تو ایک اضطراری امر ہے اور خاص اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پھر کسی حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ وہ ان اصحاب کی باتیں بھی سنتا ہے تو اس خاص واقعہ سے علی الاطلاق سماعِ موتی کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

اور دُوسری مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ سے بھی حسرت و افسوس کا احساس دلانے کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جب عزیز و اقارب میت کو دفن کر کے چلے جاتے ہیں، تو اُسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تُو مارا مارا پھرتا تھا، حتیٰ کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ دیکھ وہ اب تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہٰذا اُسے صرف جانے والوں کی آہٹ تو سُنا دی جاتی ہے، آنے والوں کی نہیں۔ اور نہ ہی قبر پہ موجود لوگوں کی گفتگو اُسے سُنائی جاتی ہے نہ ہی وہ سُن سکتا ہے۔

۴- حضور اکرم پر صلوٰۃ وسلام

(۱) لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قُبُوْرًا وَّلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا وَّصَلُّوْا عَلَیَّ فَإِنَّ صَلٰوتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ:

"اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی اُن میں نفل و نوافل پڑھا کرو) اور میری قبر کو جشنِ اجتماع نہ بناؤ اور مجھ پر دُرود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمہارا دُرود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے جہاں کہیں تم ہو (یعنی قبر کے نزدیک ہو یا دُور)۔

اور نسائی میں اس دُرود کو پہنچانے کی تفصیل یُوں بیان کی گئی کہ:

(۲) "اِنَّ لِلّٰہِ مَلٰٓئِکَۃً سَیَّاحِیْنَ فِی الْاَرْضِ یُبَلِّغُوْنِیْ مِنْ اُمَّتِیَ السَّلَامَ"

"اللہ تعالیٰ نے رُوئے زمین پر سیاح فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں"

اسی طرح دوسری کتب احادیث میں بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ جو باوجود اختلافِ الفاظ کے اس مضمون میں مشترک ہیں۔ کہ "امت کا صلوٰۃ وسلام فرشتوں کے ذریعہ نبی اکرمؐ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ چاہے کہیں سے بھی پڑھا جائے"

یہ سب احادیث سماعِ موتیٰ تو درکنار، اس کا خلاف ثابت کر رہی ہیں۔

علاوہ ازیں ایک روایت مشکوٰۃ (کتاب الصلوٰۃ علی النبی بعد التشہد فصل ثانی بحوالہ ابوداؤد اور بیہقی فی الدعوات الکبیر) یوں بھی آئی ہے:

۴۔ مَا مِنْ اَحَدٍ يُّسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى اَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ"

"جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے۔ اللہ میری رُوح مجھ پر لوٹا دیتا ہے حتّٰی کہ میں اُس کا جواب دیتا ہوں"

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ رسول اللہؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے)۔ آپؐ کی رُوح اعلیٰ علیین میں ہے، جہاں سے وہ سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے۔ اگر آپؐ قبر میں زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹائے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

۲۔ رُوح سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے سلام سننے کے لیے نہیں۔ کیونکہ مندرجہ بالا احادیث کی رُو سے سلام تو آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا ہی دیا جاتا ہے۔ آپؐ اِن جمع شدہ سب سلاموں کا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ آپؐ کی رُوح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اور آپؐ جواب دیتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ اور عام افرادِ امت میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے جسم مٹی پر حرام قرار دئے گئے ہیں اور یہ بات خصائص انبیاءؑ میں سے ہے۔ پھر جب آپؐ پر سلام و جواب کی یہ صورت ہو تو دوسروں پر اگر سلام پڑھا یا دعا کی جاتے تو اُن کا سُننا اور جواب دینا ناممکن نظر آتا ہے۔ علی الاطلاق سماعِ موتیٰ کا قبول کرنا پھر بھی محال ہے۔

سلامِ تشہد | اب رہا وہ سلام جو نماز میں تشہد کے دوران پڑھا جاتا ہے تو یہ سلام خطاب یا سلام تحیتہ ہے ہی نہیں۔ نہ ایسے سلام کو حضورؐ نے سُنا، نہ کبھی اس کا جواب دیا۔

نہ نماز میں نہ نماز کے بعد حتیٰ کہ جب صحابہ سیکھنے کی غرض سے اُونچی آواز سے یہ سلام رسولؐ اللہ کے سامنے پڑھتے یا "السلام علیکَ ایّہا النّبی" کہتے تھے۔ تب بھی آپؐ نے اس کا کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہ سلام بطورِ حکایت پڑھا جاتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب رسولؐ اللہ کی ذات ہے۔ واقعہ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ" اور اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ" تو یہ کلمہ بعینہٖ نماز میں بطورِ حکم پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام دُعا کے طور پر ہے جس کا سننے سُنانے یا جواب دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

موضوع احادیث

اس کے علاوہ بیہقی فی شعب الایمان میں ایک روایت یوں بھی آئی ہے۔ جو عوام میں مشہور ہے، نیز یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب الصّلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النّبی فصل ثالث میں بھی درج ہے:

"مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهٗ"

"جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام پڑھے تو میں اس سلام کو سُن لیتا ہوں"

یہ روایت موضوع یا من گھڑت ہے۔ اس کا راوی محمد بن مروان السدی کذاب اور وضاع ہے۔ جس کا کام ہی جھوٹی حدیثیں گھڑنا تھا۔ امام بیہقی نے اسی وضاع سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس روایت کی خود ہی تردید کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

"مَا مِنْ عَبْدٍ یُّسَلِّمُ عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ اِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكًا یُّبَلِّغُنِیْ"

"جب بھی کوئی شخص میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس سلام کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے"

گویا اصل مابہ النزاع مسئلہ کا اس وضاع نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ اس کی دوسری حدیث چونکہ دوسری صحیح احادیث کے مطابق ہے لہٰذا فرمانِ نبویؐ "اِنَّ الْكَذُوْبَ قَدْ یَصْدُقُ" کے مصداق اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام خواہ قبر پر پڑھا جائے یا دُور سے۔ آپؐ کو فرشتوں ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

نقد و نظر

واضح رہے کہ:

(۱) صحیحین کی احادیث اوّل درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ باقی صحاح کی چار کتابوں کی احادیث دوم درجہ کی اور باقی کتبِ احادیث کی روایات علی قدرِ مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی اکثر احادیث ناقابلِ اعتماد ہیں۔

۲۔ مشکوٰۃ حدیث کی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ مختلف کتب احادیث سے منتخب مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین پہلے امام حسین بن مسعود البغوی نے ۵۱۶ھ میں کی۔ اور اس کا نام مصابیح السنۃ تجویز کیا۔ اس میں ہر باب کی دو فصلیں رکھیں۔ پہلی فصل میں صحیحین کی احادیث درج کیں۔ اور دوسری میں باقی چار صحاح کی کتابوں کی۔ پھر امام محمد بن عبداللہ الخطیب نے آٹھویں صدی میں اس کو از سرِ نو مدوّن کیا۔ اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ اور اس میں ہر باب کے بعد ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا۔ اور اس میں بلا امتیاز جو حدیث ملی، درج کر دی۔ خواہ یہ درجہ اوّل یا دوم سے تعلق رکھتی ہو اور پہلے درج نہ ہوئی۔ اور خواہ یہ حدیث درجہ سوم اور چہارم سے تعلق رکھتی ہو۔

۳۔ حدیث ۳ (رَدَّ اللہُ عَلَیَّ رُوحِیْ) میں بیہقی کے ساتھ چونکہ ابوداؤد کا حوالہ بھی آگیا ہے۔ للہٰذا یہ تو فصلِ ثانی میں درج کر دی گئی اور موضوع حدیث ۱ کا فصلِ ثالث میں اندراج بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح مرعاۃ المفاتیح مولانا عبیداللہ رحمانی نے لکھی ہے۔ انھوں نے حدیث ۹۳۵ (یعنی ہماری مندرجہ حدیث ۱) پر جو حواشی لکھے ہیں، ان کا ملخص یہ ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح جزو ثانی مطبوعہ مکتبہ اثریہ سانگلہ ہل ص ۵۰۲، ص ۵۰۳):

و۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ سلام نزدیک و دور یا دُنیا کے کسی حصّہ سے آپ پڑھا جائے وہ تمام صحیح اور مشہور احادیث کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔

ب۔ میرے (شارح کے) خیال میں راجح بات یہ ہے کہ یہ سلام دعا ہے سلامِ تحیہ نہیں۔

ج۔ اس حدیث "سَمِعْتُہٗ" والی کی سند یوں ہے۔ العلاء بن عمرو۔ محمد بن مروان السدی۔ اعمش۔ ابی صالح۔ ابی ہریرہؓ مرفوعاً۔

عقیلی کہتے ہیں کہ:

۱۔ اعمش والی حدیث کا کچھ اصل نہیں۔
۲۔ العلاء بن عمرو کے متعلق ابنِ حبان اور الازدی نے کہا کہ یہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور
۳۔ محمد بن مروان السدی متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔

موضوع حدیث ۲ ابنِ عبدالبر نے الاستذکار و التمہید میں ابنِ عباسؓ سے

روایت کیا کہ:

"مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِيْهِ الْمُؤْمِنِ كَانَ يَعْرِفُهُ فِي الدُّنْيَا فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِلَّا عَرَفَهُ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ"

"کوئی بھی شخص جو اپنے مومن بھائی کی قبر پر گذرتا ہے جسے وہ دُنیا میں پہچانتا تھا۔ جب یہ گزرنے والا شخص اُس کو سلام کہتا ہے تو وہ اُسے پہچان لیتا ہے اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔"

اور اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث ابنِ ابی الدُّنیا نے زید بن اسلم سے۔ ابو ہریرہؓ سے کتاب القبور میں یوں بیان کی:

"إِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرٍ يَعْرِفُهُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَعَرَفَهُ وَإِذَا مَرَّ بِقَبْرٍ لَا يَعْرِفُهُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ"

(مرقاۃ المفاتیح۔ ج ۲۔ ص ۵۰۳ سے نقل کی گئی)

عُلمائے دین اور سماعِ موتیٰ

اس حدیث کے متعلق مستفسر ۱ جناب عبدالقادر سومرو نے استفسار فرمایا۔ یہ حدیث امام ابنِ تیمیہ نے کتاب "الوسیلہ" (مترجم ص ۲۳۳) میں درج فرمائی۔ اور امام ابنِ قیمؒ نے اپنی کتاب "کتاب الروح" کے پہلے باب میں ابن ابی الدُّنیا کی کتاب القبور کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ (کتاب الروح۔ ترجمہ از محمد داؤد راغب رحمانی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ص ۲۵) اس حدیث کے مردود ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کتاب کے مترجم ابو داؤد راغب رحمانی نے اسی کتاب کے ص ۲۲ پر ضروری بات ۲۲ کے تحت یہ صراحت فرمادی کہ "ابنِ ابی الدُّنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابلِ قبول ہیں"۔ لُطف کی بات ہے کہ ایک صفحہ پر مترجم یہ ضروری بات لکھتے ہیں۔ اور سامنے صفحہ پر ہی ابنِ ابی الدُّنیا کی یہ روایت مل جاتی ہے۔ جس سے امام ابنِ قیم نے احتجاج کیا ہے۔

مستفسر ۲ جناب محمد احسان الحق صاحب نے یہ سوال بھی (سوال ۵) کیا تھا کہ "کتاب الروح (ابن القیم) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ امام ابنِ قیمؒ اور اُن کے استاد جناب امام ابنِ تیمیہؒ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے بلکہ اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہوں نے اس مسئلہ کو اُچھالا اور ضعیف اور موضوع احادیث کا سہارا لے کر اس مسئلہ کو علی الاطلاق ثابت کرنا چاہا ہے۔ امام ابنِ تیمیہؒ اور امام قیم دونوں صاحبِ کشف و کرامات

بھی تھے۔ اور دونوں بزرگوں نے تصوف و سلوک پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر اس طبقہ کے نیچے سے قبر اور سماع موتیٰ کے مسئلہ کو کھینچ لیا جائے تو اُن کے پاس باقی رہ کیا جاتا ہے؟

اسی طرح کے ایک تیسرے بزرگ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جب شرک و بدعات کی تردید پر قلم اٹھاتے ہیں، تو جی عش عش کر اٹھتا ہے۔ اور ہم دل و جان سے اُن کی دینی خدمات کے معترف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ زیاراتِ قبور کے آداب اور کشف کے طریق بتلاتے ہیں تو نہیں سوچتے کہ آیا قبروں اور مزارات کے وجود کا بھی کوئی جواز ہے یا نہیں یا قبروں پر اس غرض سے بیٹھنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ مُردوں کو سُنانا اور اُن سے سُننا تو دُور کی باتیں ہیں۔ ان سب باتوں کی کتاب و سنت نے پُرزور تردید کر دی ہے۔

یہ تو خیر مستفسرین کے سوالوں کے جواب تھے۔ اب زیر بحث حدیث کی طرف آئیے۔ جو کہتی ہے کہ مردہ اگر سلام کہنے والے کو پہچانتا ہے۔ تو جواباً اس پر سلام بھی کہتا ہے۔ اور اگر نہیں پہچانتا تو صرف اسے لوٹا دیتا ہے۔ اور اسی طرح بعض دوسری روایتوں میں یوں بھی ہے کہ مُردہ اپنے واقف کے آنے سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے بار بار آنے جانے سے مانوس ہو جاتا ہے۔

جعلی حدیث کے نتائج

اب ایسی احادیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) قبرستان میں صرف مُردے ہی نہیں بلکہ رُوحیں بھی ہر وقت موجود رہتی ہیں اور وہ ان کے بدنوں میں ہوتی ہیں (علیین یا سجین میں نہیں ہوتیں)

(۲) ان مُردوں میں شعور بھی ہوتا ہے اور شعور کا تعلق رُوح سے ہے بدن سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مُردوں کے اجسام میں رُوحیں موجود ہوتی ہیں۔ یعنی وہ قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۳) وہ سلام وغیرہ سنتے ہی نہیں بلکہ اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سوال و جواب قبر پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قبروں میں مُردے نہیں بلکہ زندہ اور باشعور انسان تشریف رکھتے ہیں۔

اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی طبقہ صوفیاء کو ضرورت تھی۔ لیکن قرآن ان کی ایک ایک بات کی پُرزور تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دور موت کا دور ہے زندگی کا نہیں۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ مُردہ ہیں، نہ اُن میں شعور ہے، نہ یہ سُن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ اب دوہی

راستے ہیں۔ یا تو ان اماموں اور بزرگوں کی روایات، اولاقوال اور مکاشفات کو مان لیجئے اور قرآن سے دستبوار ہو جائیے۔ ورنہ ان سب خرافات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جو استثنائی صورت بیان فرمائی کہ "اللہ اگر چاہے تو مردوں کو سنا سکتا ہے"۔ اس استثناء سے اس قدر گنجائش نکالنا کہ قرآنی تعلیمات کے بالکل برعکس ہو جائے۔ آخر کہاں تک گوارا کیا جا سکتا ہے؟

کتاب الروح اور سماع موتیٰ

اس کتاب کا آغاز سماعِ موتیٰ پر بحث سے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کی کوئی آیت درج نہیں۔ آغازِ کتاب ابنِ عبدالبر کی اس روایت سے ہوتا ہے جسے ہم نے موضوع حدیث ۵ کے تحت درج کیا ہے، اس کے بعد قلیبِ بدر والی حدیث درج ضرور ہے۔ لیکن اس پر حضرت قتادہ یا حضرت عائشہؓ کا تبصرہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعد ازاں "السلام علیکم دار قوم مؤمنین" کی روایت درج ہے۔ اور پھر ابن ابی الدنیا کی روایات مذکور ہیں۔ جس کے متعلق کتاب الروح کے مترجم محمد داؤد راغب رحمانی پہلے ہی مطلع کر چکے ہیں کہ "ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابلِ قبول ہیں"۔ یہ پانچ روایات درج کرنے کے بعد بزرگوں کے اقوال اور خوابوں کے واقعات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے! اس سے آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ کتاب و سنت کے معیار پر یہ کس قدر تحقیقی کتاب کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ

حیرت کی بات ہے کہ سماعِ موتیٰ اور اسی طرح سلوک و تصوف حنفیوں (اور بالخصوص بریلوی طبقہ) میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہؒ سماعِ موتیٰ کے سخت مخالف تھے۔ آپؒ کے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے کسی شخص کو ایک قبر پر صاحبِ قبر کو پکارتے دیکھا تو کہنے لگے:

> "تجھ پر پھٹکار ہو اور تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، تو ایسے اجساد سے بات کرتا ہے جو نہ آواز سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ اختیار رکھتے ہیں"۔

پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: "وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ"

بایں ہمہ سماعِ موتیٰ کی بنیاد پر پھیلنے والے دوسرے شرکیہ عقائد کی سرپرستی کا حق جس قدر فرقہ بریلویہ نے ادا کیا ہے، کسی نے کم ہی کیا ہو گا۔ دوسرے نمبر پر دیوبندی حضرات ہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ اہلحدیث بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے۔ حتیٰ رسدی انھوں نے بھی یہ

حق ادا کر ہی دیا۔

علامہ وحید الزمان متاخرین میں ایک عالم شخصیت علامہ وحید الزمانؒ ہیں۔ یہ پہلے شیعہ تھے، پھر حنفی ہوئے۔ پھر اہلحدیث ہوئے۔ تاہم کچھ نہ کچھ سابقہ اثرات طبیعت میں باقی رہ ہی گئے۔ مثلاً آپ آخر عمر تک تفضیلت علیؓ کے قائل رہے۔ اور جہاں کہیں یزید کا نام آیا تو یزید پلید لکھا۔ آپ جب حنفی تھے تو سماع موتٰی کے قائل تھے۔ اہلحدیث ہوئے تو بھی قائل ہی رہے۔ پھر اس سماع موتٰی کے مسئلہ میں آپ کو امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے تائید بھی مل گئی۔ تو اس سماع موتٰی کے جواز کا خوب پرچار کیا۔ آپ نے قرآن کی تفسیر موضح القرآن بھی لکھی صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ لغات الحدیث بھی لکھی۔ تو جہاں کہیں آپ کو اس مسئلہ کو زیر بحث لانے کا موقع ملتا رہا آپ اسی طرح کا انداز اختیار کرتے رہے جیسا کہ ہم کتاب الروح کے حوالہ سے متعلق پیش کر چکے ہیں۔ ہم یہاں لغات الحدیث سے سماع موتٰی کے متعلق آپ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مسئلہ میں آپ کا طرز استدلال کس قدر سطحی اور جانبدارانہ قسم کا ہے۔ "سمع" کے تحت فرماتے ہیں:

" اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى "

" تو مُردوں کو (یعنی کافروں کو) اسلام نہیں قبول کروا سکتا "

"اس آیت سے سماع موتٰی کی نفی نہیں نکلتی[1] جیسے حضرت عائشہؓ نے خیال کیا، کیونکہ سماع سے یہاں سماع اجابت مراد ہے جیسے اسمع غیر مسمع میں۔ اور متعدد احادیث سے سماع موتٰی ثابت ہے جیسے اوپر گزر چکا۔ اور اہلِ حدیث کے بڑے بڑے امام جیسے ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ اسی کے قائل ہیں۔ صرف حنفیہ اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا۔ مجمع البحار میں ہے کہ "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" کا معنی یہ ہے کہ "تو ان جاہلوں کو نہیں سمجھا جا سکتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بنا دیا ہے"

(لغات الحدیث، ردیف س صـ۱۶۳)

اس اقتباس پر تبصرہ کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ کیونکہ علامہ صاحب کے ان دلائل کے متعلق ہم پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

---

[1] جب ترجمہ ہی بدل دیا تو نفی نکل بھی کیسے سکتی ہے؟ پھر ترجمہ بدل دینے کے بعد از سر نو سماع موتٰی کا ذکر ویسے ہی کھٹکتا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اہلحدیث نہ کسی امام کا مقلد ہے اور نہ علامہ کا۔ وہ اِن بزرگوں سے استفادہ تو کر سکتا ہے۔ مگر روشنی براہِ راست کتاب و سنّت سے حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سماعِ موتیٰ اور مولانا مودودی مرحوم

مولانا مرحوم نے سورۂ احقاف کی آیات ۵-۶ (جو ہم آیت ۱۳ کے تحت درج کر چکے ہیں) کے تحت بڑا جامع اور بصیرت افروز حاشیہ لکھا ہے۔ جس میں قرآنی آیات کا صحیح مفہوم، استثنا کی صورت، صحیح احادیث کا لبِّ لباب سب کچھ آجاتا ہے۔ اور اکثر اشکال بھی دُور ہو جاتے ہیں۔

ان کا یہ بیان درج ذیل ہے:

"یعنی ان پکارنے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے سُن سکتے ہیں، نہ کسی ذریعہ سے اُن تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دُنیا میں انھیں کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشادِ الٰہی کو تفصیلاً یُوں سمجھئے کہ دُنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں۔ وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک بے رُوح اور بے عقل مخلوقات، دُوسرے وہ بزرگ جو گزر چکے ہیں۔ تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بھی بگڑے ہوئے تھے اور دُوسروں کو بھی بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبُودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے۔ رہے دوسری قسم کے معبُود، جو اللہ کے مقرب بندے تھے تو اُن کے بےخبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں، جہاں انسانی آوازیں براہِ راست اُن تک نہیں پہنچتیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا سکھلاتے رہے تھے۔ وہ اب اُلٹے آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر اُن کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبُودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے بھی بےخبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی

حوالات سجین) میں بند ہیں جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی انھیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمھارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے۔ اور لوگ تمھارے پیچھے تمھیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ یہ خبریں اُن کے لیے مسرت کا موجب ہوں گی اور خدا اُن کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعائے رحمت (جیسے قبر پر یا نماز میں) پہنچا دیتا ہے" کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے فرحت کا موجب ہیں۔

اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکار اور زجر و توبیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگِ بدر میں مارے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبیخ سنوا دی گئی۔ کیونکہ اُن کے لیے یہ اذیت کا موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کا موجب یا مجرمین کے لیے فرحت کا موجب ہو، اُن تک نہیں پہنچائی جاتی۔ اس تشریح سے سماعِ موتیٰ کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔"

مسئلہ سماعِ موتیٰ کی پشت پناہی

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ قرآن اس مسئلہ کی پرزور تردید کرتا ہے۔ احادیثِ صحیحہ کو سامنے رکھ کر اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو بھی حضرت عائشہؓ کے دلائل راجح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعد کے ادوار میں اُمت کے ایک بڑے طبقہ نے سماعِ موتیٰ کے مسئلہ کو درست سمجھا۔ یہ طبقہ دوسری صدی میں صلحاء، زہاد کا طبقہ کہلاتا تھا۔ بعد میں گو وہ صوفیاء کہلانے لگا۔ اس طبقہ کا سارا کاروبار ہی سماعِ موتیٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ مزارات، یہ چلّے کشیاں، یہ زیارات و مکاشفات، یہ حاجت روائیاں اور تصرفاتِ امور غرض جتنی اس طبقہ کو سماعِ موتیٰ کے مسئلہ کی پشت پناہی اور حفاظت کی ضرورت ہے اور کسی مسلک کی نہیں۔ اگر قبر میں پڑے ہوئے بزرگ قبر پر بیٹھ کر مراقبہ کرنے والے بزرگ کی بات ہی نہ سن سکیں یا کسی سائل کی یہ بزرگ درخواست سن ہی نہ سکیں تو آگے کام کیسے چل سکتا ہے؟ یہ طبقہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ عام مُردے سنتے ہیں یا نہیں؟ انھیں اس معاملے سے کوئی غرض نہیں انھیں اگر غرض ہے تو صرف یہ کہ اُن کے بزرگ

مُردوں کو ضرور سُننا چاہیے۔

اب دیکھیے صحابہؓ میں اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ سماعِ موتٰی کے مسئلہ پر ہی نہیں ہُوا۔ اور بھی کئی مسائل[1] میں ہُوا ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ اس بات کے قائل نہ تھے کہ اگر پانی نہ ملے تو جنبی شخص صرف تیمم سے بھی پاک ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عمار بن یاسرؓ نے اس سلسلہ میں اپنا ذاتی واقعہ بھی پیش کیا اور کہا کہ "میں خود ایک دفعہ رسولؐ اللہ کے ہمسفر تھا کہ جنبی ہو گیا۔ پانی نہ ملا تو مٹی میں لوٹ پوٹ لگائی۔ پھر نبی اکرمؐ سے واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ صرف اتنا کر لینا ہی کافی تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اپنے چہرہ مبارک اور ہاتھوں کو مسح کیا"۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا اور کسی واضح ضعف کے سبب جو ان کو اس روایت میں نظر آیا۔ ان کے نزدیک یہ روایت دلیل نہ ٹھہری۔

مگر دوسرے اختلافی مسائل کا یا تو بعد میں اختلاف ختم ہو گیا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا جنبی کے تیمم کے درست ہونے کو بعد کے ادوار میں سب نے تسلیم کر لیا۔ یا اگر رہا تو اسی حد تک جس حد تک کہ دورِ صحابہؓ میں تھا۔ مثلاً صبح کی نماز کی سنتیں اگر قضا ہو جائیں تو وہ نماز کے فوراً بعد پڑھی جا سکتی ہیں۔ یا سورج نکلنے کے بعد ہی پڑھی جائیں! لیکن سماعِ موتٰی کا مسئلہ ایسا ہے کہ جو دورِ صحابہؓ میں تو معمولی قسم کا اختلافی مسئلہ تھا مگر بعد کے ادوار میں یہ سنگین اور بنیادی قسم کا مسئلہ بن گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک فرقہ کے وجود کا انحصار ہی سماعِ موتٰی کے اثبات پر تھا۔

پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو مُردوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ مثلاً یہ بات کہ "مُردے بولتے ہیں"۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ جب مُردہ نہلا کر کھاٹ پر رکھا جاتا ہے۔ تو اگر وہ نیک ہو تو "قَدِّمُونِي قَدِّمُونِي" یعنی مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو کہتا ہے۔ اور اگر بد ہے تو کہتا ہے کہ "مجھے کہاں لئے جا رہے ہو" وغیرہ۔ لیکن کبھی آپ نے سُنا ہے کہ یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا ہو؟ اگر زیرِ بحث آتا ہے تو وہی مسئلہ جو قبر پرستی اور شرک کی بنیاد ہے جس سے ایک طبقہ کا کاروبار بھی وابستہ ہے اور معاش بھی۔ باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی پُرزور تردید فرمائی تھی، لوگوں نے اس کی راہ نکال ہی لی۔

---

[1] ، [2] فقہی اختلافات کی اصلیت۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ و نشر و اشاعت علماء اکیڈمی لاہور صفحہ ۹ طبع اول (۱۹۸۱ء)

چوتھا مرحلہ:۔ اُخروی زندگی

یہ عرصہ بعث بعد الموت سے لے کر ابد تک ممتد ہے۔ یہ دور مکمل اور مستقل زندگی ہے۔ رُوح کو جو جسم اس دور میں مہیا کیا جائے گا اُس کی شکل و صورت وہی ہوگی جیسی اس دنیا میں تھی۔ اور وہ سب لوگ خواہ جنتی ہوں یا دوزخی ایک دوسرے کو اسی وجہ سے پہچانتے ہوں گے کہ اُن کی شکلیں اور صورتیں بالکل وہی ہوں گی جو اس دنیا میں تھیں۔ البتہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اس دور میں جو جسم رُوح کو عطا کیا جائے گا۔ اس کا سائز اس جسم سے بہت بڑا ہوگا جو اُسے دنیا میں دیا گیا تھا۔

اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام بنی آدم اپنے اعمال کی بنیادوں پہ گروہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس دور میں استثنائی صورت یہ ہے کہ دوزخی لوگ تو عذاب کی صورت میں ہر آن موت و حیات سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ جبکہ جنتی لوگوں کے لیے کسی استثنائی صورت کا ذکر نہیں۔

اس دور میں جنتی لوگ اپنے ربّ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ وہ اس دن اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھیں گے جیسے اس دنیا میں بدر کو دیکھ سکتے ہیں اور کوئی اڑچن محسوس نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم اپنے سابقہ مضمون میں بتلا چکے ہیں کہ ان احادیث کی روشنی میں نہ کہیں تناسخ کی گنجائش نکلتی ہے نہ رُوحِ اعظم یا رُوحِ کلی کی اور نہ ہی واصل باللہ، فنا فی اللہ، واصل بحق کی یا ایسے ہی کسی کی ذات میں اللہ کے حلول کرنے کی۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کے یہ چاروں مراحل بیان کرنے کے بعد فرمایا: "ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ"۔ آیت کے یہ آخری الفاظ ایسے تمام باطل نظریات کو ردّ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس "إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" کے ضابطہ الٰہی میں کوئی استثنا بھی نہیں ہے۔

اَرواح کی بین المراحل پیش رفت اور مراجعت

ہم رُوح کے چاروں مراحل کی ترتیب اور ان مراحل میں اگر کسی میں کچھ مستثنیات ہیں تو ان کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک ایسے استثناء کا ذکر کریں گے جو مرحلہ ۳ کو سرے سے ہی حذف کر دیتا ہے۔

شہداء کی زندگی

رُوح کے اس تدریجی سفر میں شہداء کی فضیلت یہ ہے۔ کہان سے مرحلہ ۳ حذف کر دیا گیا ہے۔ نہ اُن کی قبر میں منکر نکیر کے ذریعہ جانچ ہوتی ہے۔ اور نہ محض صبح و شام اُن پر جنت کی طرف سے روزن کھلتا ہے۔ بلکہ وہ شہید ہوتے ہی سیدھے مرحلہ ۴ میں یعنی جنت میں چلے جاتے ہیں۔ یہ فرق البتہ ضرور رہ جاتا ہے کہ جنت میں ان کو سبز پرندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرحلہ ۴ میں ارواح کو اسی شکل و صورت کے اجسام مہیا کئے جائیں گے جو مرحلہ ۱ یعنی دنیوی زندگی میں تھے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا بھی درست ہے کہ انبیاء جو شہداء بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی بھی قبر میں جانچ نہ ہو۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی جانچ ہوتی ہے اُن کے معلم تو وہ خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی جانچ کیسے؟ ان کی ارواح بھی اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں۔ انبیاءؑ کی دوسری خصوصیات یہ ہیں (۲) ان کے اجساد مٹی پر حرام ہیں اور (۳) وہ عذاب قبر کی آواز سن لیتے ہیں دوسرا کوئی نہیں سن سکتا۔

رُوحوں کی واپسی

عام ضابطہ الٰہی کے مطابق رُوح کا پچھلے مرحلہ کی طرف واپسی کا کوئی قانون نہیں۔ جو رُوحیں سجین میں ہیں، وہ تو اس لیے دُنیا میں واپس نہیں آسکتیں کہ وہ اللہ کی حوالات میں مقید ہیں۔ اور جو روحیں علیین یا اعلیٰ علیین (جنت) میں ہیں، وہ مجرموں کی طرح مقید تو نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنت کی نعمتیں یا بلند مقام چھوڑ کر آخر زمین کی طرف کیا لینے آئیں گی؟

اس قانون میں استثناء صرف یہ ہے کہ جب فرشتے کسی انسان کی، خواہ نیک ہو یا بد، رُوح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ رُوح سجین یا علیین میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس وقت اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ جب اس کے عزیز و اقارب اس کے دفن کرنے کے بعد واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ رُوح کا اس وقت لوٹانا ایک اضطراری امر ہے۔ کیونکہ جانچ ہر انسان سے کی جاتی ہے، ماسوائے شہداء اور انبیاءؑ کے۔

اس آزمائش کے بعد بھی رُوحیں سجین اور علیین میں رہتی ہیں۔ ان رُوحوں کو انہی مقامات پر رہنا ہوتا ہے اور اس کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو مرحلہ ۲ میں خواب میں ہوتی ہے۔ پھر کبھی کبھی اس عذاب و ثواب میں کچھ اضافہ کی خاطر روح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ رُوح کی یہ احیاناً فاحیاناً بدن کی طرف بازگشت بھی ایک اضطراری امر ہے۔ اسی گاہے گاہے بازگشت کو

قرآن میں صبح و شام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اضافہ بدن کی شرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خواب میں کسی شدید واقعہ سے سونے والے کا بدن بھی متاثر ہو جاتا ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ رُوحیں مرنے کے بعد یعنی علیین اور سجین سے اپنی قبروں پر تشریف لائیں۔ یا اُن سے مسلسل رابطہ قائم رکھیں یا اپنی قبروں پر عکس ڈالتی رہیں تاکہ جو کوئی انھیں آکر سلام کہے، وہ اس کے سلام کو سُن کر اُس کا جواب دیں۔ تو حاشا۔ وکلا ان میں کوئی بات بھی رُوحوں کے اختیار میں نہیں ہے۔

لیکن ہمارے تصوف زدہ طبقہ نے زیرِ زمین ایک نئی دنیا آباد کر رکھی ہے۔ اُن کے نزدیک عام آدمی نہیں تو کم از کم بزرگ حضرات اپنی اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دُنیا میں زندہ تھے۔ البتہ ان بزرگوں میں اب تصرف فی الامور کی قدرت دنیا کے لحاظ سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ گویا اس دنیا کے جملہ اختیارات انہی فوت شدہ بزرگان کو تفویض کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بزرگ لوگوں کی فریاد سنتے بھی ہیں۔ اور اس تکلیف کو دُور کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہؐ تو قبر میں دنیا کی طرح زندہ رہنے کے اور بھی زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ دُنیا بھر کے مسلمان آپؐ کے روضہ پر جا کر سلام پڑھتے ہیں۔ اور ان کا آپؐ کو جواب دینا ہوتا ہے۔ اور جب تک قبر میں زندہ تسلیم نہ کیے جائیں۔ وہ سلاموں کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" مگر یہ حضرات مُصر ہیں کہ رسول اللہؐ کی ذات تو بڑی دُور کی بات ہے۔ ہمارے اولیاء بھی قبروں میں زندہ موجود ہیں۔ موت اُن کے لیے صرف ایک پردہ ہے۔ بس جونہی قبر میں پہنچتے اور دُنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ان میں مکمل دنیوی زندگی عود کر آتی ہے۔ اور کسی عاشقِ رسولؐ نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ قبر میں رسول اللہ کے وہی اعمال و اشغال ہوتے ہیں جو اس دُنیا میں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ قبر میں ان پر ازواجِ مطہرات بھی پیش کی جاتی ہیں۔" نعوذ باللہ من ہذہ الھفوات۔

نگاہِ بازگشت (۱) رُوح اللہ کی مخلوق ہے۔ حادث ہے۔ قدیم نہیں۔ اور چونکہ مخلوق ہے، لہٰذا کسی نہ کسی وقت فنا سے دوچار بھی ہوگی۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

"كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ"

(الرحمٰن: ۲۶۔ ۲۷)

"ہر چیز جو اس کائنات میں ہے فنا ہونے والی ہے۔ صرف تیرے بزرگ و برتر پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی۔"

۲۔ روح پر چار مراحل آتے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں جاکر اسے بدن ملتا ہے۔ جو آلہ کار کا کام دیتا ہے کیونکہ یہی عرصہ دارالامتحان ہے۔ تیسرے مرحلہ میں روح سے بدن کا آسرا چھین لیا جاتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں روح کو نیا بدن عطا کیا جائے گا۔ تاکہ مرحلہ ۲ کے اعمال کا بدلہ روح اور بدن مل کر بھگت سکیں۔

۳۔ ان چاروں مراحل میں روح زندہ ہی رہتی ہے۔ اور روح ہی وہ شے ہے جو عقل و شعور اور ارادہ و اختیار رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کا دور وہ ہوتا ہے جب روح کو بدن بھی نصیب ہوتا ہے۔ بدن اگرچہ بے جان بہت جلد فنا ہونے والی اور عقل و شعور یا ارادہ و اختیار سے عاری ہے۔ تاہم زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ جس مرحلہ میں روح کو بدن نصیب نہ ہو وہ موت کا دور کہلاتا ہے۔

۴۔ ان چاروں مراحل میں روح چونکہ زندہ رہتی ہے۔ لہٰذا چاروں مراحل میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ آثار چونکہ روح و بدن کے اتصال والی زندگی کی نسبت نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان ادوار یعنی مرحلہ ۱ اور مرحلہ ۳ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ جن ادوار میں زندگی ہی غالب ہے یعنی مرحلہ ۲ اور مرحلہ ۴، ان میں بھی موت کی استثنائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے احیائے موتی بطور خرقِ عادت اور خواب بطورِ عام ضابطہ الٰہی۔ تاہم یہ موت کے کمزور سے آثار غیر مسلسل اور غیر مستقل ہوتے ہیں۔

۶۔ بعینہٖ موت کے دور یعنی مرحلہ ۳ میں بھی استثنائی صورتوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ آثار حقیقی زندگی کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ جیسے عذابِ قبر جو آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ اور سماعِ موتی کا مسئلہ بطور خرقِ عادت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کسی مردہ کی روح کو سنا دیتا ہے۔ اس میں اس مردہ کی روح کے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔

۷۔ مرحلہ ۳ میں روح کا مستقر علیین یا سجین ہے۔ اس مرحلہ میں عذاب و ثواب قبر کا تعلق براہِ راست روح سے ہوتا ہے۔ اور یہ عذاب و ثواب آخرت کی نسبت ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ عذاب بواسطہ روح جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۸۔ شہداء اور انبیاء سے مرحلہ ۳ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی ان پر موت کے بجائے زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی دنیاوی زندگی کی طرح نہیں ہوتی۔ اس زندگی

کی کیفیت کو سمجھنا ہمارے شعور سے ماوراء ہے لہٰذا ہم ان کی اس زندگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۹۔ رسول اللہ پر صلوٰۃ وسلام، دُور سے ہو یا قبر پر، صیغہ غائب سے ہو یا مخاطب سے، بجیے غائبانہ فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ ہر سلام کہنے والے کو جواب دیں، یہ سلام امت کی طرف سے اجتماعی طور پر فرشتوں کے ذریعہ پہنچائے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح آپ اجتماعی طور پہ جواب کے طور پہ امت کے لئے سلام کہتے یا سلامتی کی دعا کہتے ہیں، کیونکہ راجح قول یہی ہے کہ آپ پر جو سلام وصلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وہ سلامِ دعا ہے نہ کہ سلامِ تحیۃ۔ اسی طرح قبرستان میں جاکر مسلمانوں کو جو السلام علیکم کہا جاتا ہے۔ وہ بھی سلامِ دعا ہے، سلامِ تحیۃ نہیں۔

۱۰۔ قرآن سماع کی پر زور تردید کرتا ہے۔ صحیح احادیث استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی احادیث سماعِ موتیٰ کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگانِ کرام کے اقوال اور اُن کی خوابیں اس جواز کو تائیدِ مزید بخشتی ہیں۔ اَب مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اگر ان بزرگانِ کرام کا احترام ملحوظ رکھ کر یہ سب درست تسلیم کرلیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جعلی احادیث اور بزرگوں کی خوابیں اور اقوال درا صل قرآنی آیات کا رد پیش کررہے ہیں۔

ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب!



برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف

مراسلات متعلقہ (۱)

روح — مقام قبر — سماع موتیٰ

(یہ جوابات محدث رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوئے)

مقالہ مذکورہ کی اشاعت کے بعد مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں مختصر خط تو جناب اسحاق صاحب (مدینہ منورہ) کا تھا جنھوں نے ایک موضوع حدیث کی نشان دہی فرمائی اور جس کا ذکر "پیش لفظ" میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ ہم اس نشاندہی کے لیے آپ کے مشکور ہیں۔ یہ حدیث چونکہ محض تائیداً درج کی گئی تھی، لہٰذا اس کتاب سے خارج کر دی گئی ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر کیپٹن مسعود عثمانی (توحید روڈ۔ کیماڑی۔ کراچی) کے نظریات برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم سے کافی متاثر ہیں۔ پھر اسی مرکزی نقطۂ نظر کے مطابق کچھ سوالات، کچھ اشکالات، کچھ اعتراضات پیش کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کو من وعن درج کرنا تو بہت طوالت کا باعث ہوگا، میں مختصراً ان کے سوالات یا

اشکالات کو پیش کروں گا، اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا اصل مفہوم اوجھل نہ ہونے پائے۔ پھر ان کے جوابات عرض کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ان میں سے پہلے مستفسر تو جناب شاہ فاروق ہاشمی صاحب (ٹیچر گورنمنٹ پرائمری سکول قائد آباد۔ ضلع خوشاب) ہیں۔ ان کا خط سب سے پہلے موصول ہوا اور سب سے زیادہ طویل ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کو دلائل سے پیش کیا ہے پھر میرے پیش کردہ نظریہ پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں۔

اور دوسرے مستفسر جناب عبدالقادر سومرو صاحب (کیماڑی۔ کراچی) ہیں جو ہمارے پرانے کرمفرما ہیں۔ انہوں نے اس نظریہ کی تائید میں مندرجہ ذیل کتابوں میں سے موضوعِ زیرِ بحث سے متعلقہ فوٹوسٹیٹ بھیجے ہیں۔ اور ساتھ کچھ رجال کی کتابوں میں سے متعلقہ راویوں پر تنقید کے فوٹوسٹیٹ بھی۔ ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ندائے حق از محمد حسین نیلوی۔

۲۔ دعاء کرنے کا اسلامی دستور از فضل الرحمٰن کاشمیری۔

۳۔ توحید خالص قسط ۲۔ یہ قبریں یہ آستانے از ڈاکٹر مسعود عثمانی۔

۴۔ ہفت روزہ الاسلامؒ کے ایک مضمون "مسئلہ سماعِ موتی" سے چند اقتباسات۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومرو صاحب ایک طرف میرے پیش کردہ نظریہ سے متاثر ہیں۔ دوسری طرف مذکورہ بالا کتب میں پیش کردہ نظریہ سے بھی متاثر ہیں۔ لہٰذا وہ متذبذب ہیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں راہنمائی چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم مستفسر ۱ کے دلائل، اس کا جواب اور ان دلائل کا جائزہ پیش کریں گے:

۱۔ قبر کا اصل مقام:

اس دعوٰے سے متعلق کہ "قبر سے مراد زمینی گڑھا یا حسی قبر نہیں بلکہ برزخی قبر ہے" مستفسر ۱ کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ قرآن میں حضرت نوحؑ کی قوم کے متعلق آیا ہے کہ "اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا" اور فا تعقیب کے لیے آتی ہے۔ حالانکہ قوم نوح کو، اور اسی طرح قوم فرعون کو بھی،

قبر نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ اور قرآن نے یہ کلیہ بھی بتلایا ہے کہ "ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ" (۸۰:۲۱)
"اللہ نے انسان کو موت دی پھر اسے قبر میں داخل کیا" یعنی ان غرق ہونے والوں کو زمینی قبر تو نصیب ہی نہ ہوئی تھی لیکن عذاب مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پھر مرنے کے ساتھ ہی قبر کا ذکر بھی موجود ہے۔ لہٰذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔ اور یہ گڑھا تو مجازی قبر ہے جو دنیا میں بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ب: حدیث میں آیا ہے:

اِنَّمَا مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی یَہُوْدِیَّۃٍ یُبْکٰی عَلَیْہَا فَقَالَ اِنَّہُمْ لَیَبْکُوْنَ عَلَیْہَا وَاِنَّہَا لَتُعَذَّبُ فِیْ قَبْرِہَا ۔

(مشکوٰۃ باب البکاء علی المیّت)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ پر گزرے جس پر رویا جا رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا "یہ لوگ اس پر روتے ہیں جبکہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔"

اس یہودیہ کے متعلق جس کا جنازہ دیکھ کر ہی آپؐ نے فرمادیا تھا کہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برزخی قبر ہے۔ جہاں وہ دفن ہونے سے پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھی۔

ج: جب روزِ قیامت مردے اپنی اپنی قبروں سے جی اٹھیں گے تو اس وقت سے پہلے ہی موجودہ زمین و آسمان تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ پھر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا کیسے لیا جا سکتا ہے؟

۲۔ کیا عذابِ قبر کا تعلق جسم سے بھی ہے؟

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ عذابِ قبر سے کسی نہ کسی حد تک جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ خواہ یہ مقدار کتنی ہی کم یا گاہے گاہے ہو، لیکن ہوتا ضرور ہے اور اس پر دلیل یہ تھی کہ جیسے نیند میں بعض اوقات روح کو وارداتِ رنج و راحت سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے اسی طرح عذابِ قبر سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس پر آپ نے دو اشکال پیش کیے ہیں:

(۱) فرعون کا جسم دنیا میں موجود ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح بھی فرمادی کہ

"فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ" تو پھر عذاب میں جسم کی شمولیت کیونکر ہوئی؟

(ب) کافر قیامت کے دن کہیں گے:

"مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا" (یٰسٓ: ۵۲)

"ہمیں ہماری آرام گاہ سے کس نے اٹھا دیا؟"

اب اگر اس زمینی گڑھے کو قبر، اور جسم سے عذاب کا تعلق بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ قبر عذاب گاہ ہوئی۔ آرام گاہ کیسے ہوئی؟

یہ تو ہیں فاروق صاحب کے دلائل! ـــــــ اور سومرو صاحب نے جو کتابوں سے فوٹوسٹیٹ بھیجے ہیں، ان سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بس انداز بیان الگ الگ ہے۔ میرے خیال میں یہ حضرات دوسری انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ سماع موتٰی کے قائلین اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر میں مُردہ ہر واقف کار کا سلام سنتا اور پھر اس کا جواب دیتا ہے یا یہ کہ "مَنْ فِی الْقُبُوْرِ" سے مراد مُردہ دل لوگ ہیں۔ جبکہ ہمارے یہ کرم فرما اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر کا معنٰی ہی بدل دو، پھر سلام کیا، اس کا سننا اور جواب دینا کیسا؟ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ تاویل و تعبیر کی ہے وُہ اس لیے کی ہے کہ شرک کے اس سب سے بڑے چور دروازے کی جڑ ہی کٹ جائے۔ ان کا یہ خلوصِ نیت دُرست اور مبارک، مگر ہمیں افسوس ہے کہ حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ بھلا سوچئے! اگر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہ ہو بلکہ برزخی مستقر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدر کے کنوئیں پر جا کر ان مُردہ کفار کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپؐ اپنی جگہ پر بیٹھے یا کھڑے ہی یہ خطاب فرما دیتے؛ اسی طرح آپؐ بقیع میں جا کر کیوں دعائے مغفرت فرماتے تھے؟ اور آخر قبرستان میں جا کر ہی کیوں آپؐ "السلام علیکم یا اہل القبور" کہتے ہیں؟

اب میں اپنے نظریہ کی تائید میں چند مزید احادیثِ صحیحہ پیش کروں گا:

پہلی حدیث:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَیْنِ یُعَذَّبَانِ فَقَالَ اِنَّہُمَا لَیُعَذَّبَانِ وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ، اَمَّا اَحَدُہُمَا فَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَکَانَ یَمْشِیْ بِالنَّمِیْمَۃِ۔ ثُمَّ اَخَذَ

جَرِیْدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَیْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِیْ کُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً فَقَالُوْا: "یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَ صَنَعْتَ ھٰذَا؟" فَقَالَ: "لَعَلَّہٗ اَنْ یُّخَفَّفَ عَنْھُمَا مَا لَمْ یَیْبَسَا"

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب الجرید علی القبر)

"ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں پر گزرے جنھیں عذاب ہو رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا، "ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی پاداش میں بھی نہیں۔ ایک تو پیشاب سے بچاؤ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا پھرتا تھا" پھر آپؐ نے کھجور کی ایک ہری ڈالی لی اور اس کو بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کیے اور ہر قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے ایسا کس لیے کیا؟" آپؐ نے فرمایا۔ "جب تک یہ ڈالیاں نہ سوکھیں شائد ان کا عذاب ہلکا ہو۔"

اب دیکھیے اس حدیث سے مندرجہ بالا دونوں اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔ وُہ یوں کہ:

۱۔ لفظ "مَرَّ بِقَبْرَیْنِ" اس بات کا متقاضی ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھے ہیں نہ کہ برزخ میں رُوح کا مستقر۔

۲۔ آپؐ نے اسی قبر پر ہری ڈالی گاڑی جس میں جسم مدفون تھے اور فرمایا کہ شائد اس سے عذاب ہلکا ہو۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جسم بھی عذاب سے متاثر ہوتا ہے۔

دوسری حدیث:

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَدْ وَجَبَتِ الشَّمْسُ فَسَمِعَ صَوْتًا فَقَالَ، "یَھُوْدُ تُعَذَّبُ فِیْ قُبُوْرِھَا" (بخاری، کتاب الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر)

"ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ سے) باہر نکلے اور اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ آپؐ نے ایک آواز سنی تو فرمایا، "یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔"

اگر قبر سے مراد برزخی قبر لی جائے تو لفظ "خَرَجَ" بے کار ہے۔ مدینہ میں رہ کر بھی آپؐ یہ بات بیان فرما سکتے تھے۔ آخر آپؐ نے قبروں کے پاس جا کر کیوں ایسے فرمایا؟

تیسری حدیث :

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ أَسْوَدَ رَجُلًا أَوِ امْرَأَةً كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَلَمْ يَعْلَمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: "مَا فَعَلَ ذٰلِكَ الْإِنْسَانُ؟" قَالُوْا: "مَاتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" قَالَ: "أَفَلَا آذَنْتُمُوْنِي؟" فَقَالُوْا: إِنَّهُ كَانَ كَذَا وَكَذَا قِصَّتُهُ قَالَ فَحَقَرُوْا شَأْنَهُ۔ قَالَ: فَدُلُّوْنِي عَلٰى قَبْرِهِ فَأَتٰى قَبْرَهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ" (بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی القبر بعد ما یدفن)

"ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک کالا مرد (یا کالی عورت) مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔ وہ مر گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی۔ ایک دن آپؐ نے اُسے یاد فرمایا اور پوچھا کہ "وہ کدھر ہے اسے کیا ہوا؟" لوگوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! وہ تو مر گیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تو پھر تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟" لوگوں نے عرض کیا کہ "یوں ہوا اور یوں ہوا" غرض اس کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے آپؐ کو اس کی موت کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ آپؐ نے فرمایا "مجھے اس کی قبر پر لے چلو" راوی کہتا ہے کہ پھر آپؐ اس کی قبر پر آئے اور اس پر نمازِ جنازہ پڑھی۔"

یہ حدیث بھی اپنے مضمون میں صاف ہے کہ (۱) قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے ورنہ آپؐ اس کی قبر پر کیوں تشریف لے گئے؟ (۲) یہ کہ قبر پر آ کر دعائے استغفار کرنے یا نماز جنازہ پڑھنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس قبر میں جو جسم پڑا ہے اس کا عذاب و ثواب قبر سے تعلق ضرور ہے۔

اور قرآن میں یہ الفاظ وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ قبر سے مراد زمینی گڑھا ہونے کی پوری وضاحت کر رہے ہیں

مستفسر کے دلائل کا جائزہ اب ہم فاروقی صاحب کے دلائل پر تبصرہ

کرتے ہیں:

۱۔ یہ مفروضہ کہ "یہ دنیاوی (حسّی) قبر تو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے" درست نہیں۔ جن اقوام پر خدا کا عذاب آیا اور قرآن میں مذکور ہے۔ اگر صرف ان کا تناسب نکالا جاتے تو بھی یہ مفروضہ درست ثابت نہیں ہوتا جبکہ بیشمار ایسی اقوام ہیں جن پر عذاب نہیں آیا۔ وُہ لوگ اپنی طبعی موت مرتے رہے اور زمین میں دفن ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ابتدائے نوعِ انسان سے جاری ہے۔ یعنی جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا، جو اس دنیا میں پہلا قتل بھی تھا اور پہلی موت بھیؔ تو اسے اللہ کی طرف سے مردہ کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا گیا اور یہی طریقہ تمام انبیاءؑ سکھلاتے رہے۔ لہٰذا قاعدہ کلّیہ کے طور پر یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ انسان مرنے کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے۔ اب اگر آلِ فرعون یا قومِ نوح غرق ہو گئے یا اہلِ سبا پر سیلاب آیا یا دنیا بھر میں سے ایک قوم (ہندو) اپنے مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلا دیتی ہے تو یہ سب باتیں مستثنیات میں شمار ہوں گی اور آج اگر کوئی چاہے تو خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قبر میں دفن ہونے والوں کی تعداد ڈوبنے یا جلنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا عام قاعدہ کے طور پر جو بات کہی جا سکتی ہے وُہ یہی ہے کہ "ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ"۔ باقی سب استثناء کی صورتیں ہیں جیسا کہ عذابِ قبر بذاتِ خود ایک استثنائی صورت ہے جس کی تفصیل میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ یہ دور قرآن کی زبان میں موت کا دَور ہے نہ کہ زندگی کا۔

۲۔ آپ نے جو حدیث اپنے دعوٰی کے ثبوت میں پیش فرمائی ہے اس کے الفاظ ہیں: "مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی یَہُوْدِیَّۃٍ" یعنی آپؐ ایک یہودیہ پر گزرے جس پر لوگ رو رہے تھے۔" اس حدیث میں قطعاً یہ وضاحت نہیں کہ آپؐ اس کے جنازے یا میت پر گزرے یا اس کی قبر پر؟ اغلب گمان یہی ہے کہ آپؐ اس کی قبر کے سے گزرے تھے جیسا کہ اس مشکوٰۃ کے ترجمہ سے بھی ظاہر ہے۔ ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

"گزرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزدیک قبر ایک عورت یہودیہ کے کہ رویا جاتا تھا اس پر۔" (مشکوٰۃ، باب البکاء علی المیت مطبوعہ مکتبہ اثریہ

سائنگلہ ہل ص ۱۸۲)

۳۔ تیسری دلیل یہ تھی کہ جب زمین ہی بدل جائے گی تو یہ زمینی گڑھا کہاں رہے گا؟ سو گزارش ہے کہ زمین بدل ضرور جائے گی لیکن نیست ونابود یا فنا نہیں ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ "یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ" بہر حال اس وقت بھی کوئی نہ کوئی زمین ضرور ہو گی جو اگرچہ یہ موجودہ زمین نہ ہو گی تاہم اسی زمین کی بدلی ہوئی شکل ہو گی۔

۴۔ جسم کے عذاب سے بے تعلق ہونے کی دلیل جو لفظ مرقد (خواب گاہ یا آرام گاہ) سے لی گئی ہے۔ یہ بھی وضاحت کے لحاظ سے سود مند نہیں۔ ان کفار کا یہ قول تو صرف انسانی فطرت کا مظہر ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ پھر اس سے بڑی مصیبت یا آفت اس پر آن پڑے تو اسے یہ چھوٹی مصیبت کا زمانہ آرام کا زمانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا جب کافر "اشد العذاب" کو دیکھیں گے تو انہیں یہ کم عذاب والی جگہ اس کے مقابلہ میں مرقد ہی معلوم ہو گی۔ اب خواہ یہ عذاب حسّی یا مادی قبر میں ہو رہا ہو یا برزخی قبر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ رہا یہ سوال کہ فرعون کو مرنے کے وقت سے لے کر عذاب ہو رہا ہے مگر اس کا جسم بمصداق ارشادِ باری تعالیٰ عذاب کے اثرات سے محفوظ و مامون ہے۔ تو یہ محض ایک استثنائی صورت ہے، جس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ، کسی بھی انسان کا جسم خواہ وہ نیک ہو یا بد، عذاب و ثوابِ قبر سے کلیۃً اور کبھی بھی متاثر نہیں ہوتا، درست نہ ہو گا۔ اوپر درج شدہ احادیث ہمارے اس خیال کی تائید میں پوری رہنمائی کرتی ہیں۔

۳۔ رُوحوں کی ملاقات:

اس سوال میں آپ نے کئی اشکالات کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً:

(۱) خواب میں جب رُوح بدن سے علیحدگی ہو گئی تو اسی انفکاکِ روح ہی کا نام تو موت ہے۔ پھر اگر جسم کو بھی عذاب و ثواب میں شریک سمجھ لیا جائے تو یہ زندگی ہوئی موت تو نہ ہوئی؟

(۲) خواب میں کسی شخص کی رُوح جب کسی مرے ہوئے ظالم انسان کی رُوح سے،

جو سجین میں مقید ہے، ملتی ہے تو کیا اس سونے والے شخص کی روح وہاں پہنچ جاتی ہے یا اس ظالم اور ڈاکو انسان کی روح وہاں سے آزاد ہو کر اسے خواب میں آ کر ڈراتی دھمکاتی ہے؟ وہ ضابطہ الٰہی کو توڑ کر اس دنیا میں کیسے آجاتی ہے؟

۳۔ ایک ہی خواب میں ایک روح کئی آدمیوں کو خواب میں ملتی ہے تو کیا ایک ہی روح سب کو ملتی ہے یا علیحدہ کوئی روح؟

ان سوالوں کا جواب دینے کی بجائے میں فاروق صاحب کو یہ مشورہ دوں گا کہ میرے مضمون کا متعلقہ حصہ دوبارہ غور سے پڑھ لیں، خصوصاً ص ۲۴ کا یہ پیرا کہ:

"یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان تجربات و مشاہدات کی وجوہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو وہ اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا"۔"

لہٰذا میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ایسی باتوں کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں جن کا سمجھنا انسان کی عقل سے ماوراء ہے۔ نہ ہم ان باتوں کے سمجھنے کے مکلف ہیں اور نہ ایسی باتیں اعتقادات میں کوئی مقام رکھتی ہیں۔

۴۔ جدث اور قبر:

جدث اور قبر کا فرق میں نے یہ بیان کیا تھا کہ قبر وہ ہے جس کے نشانات موجود ہوں اور جدث وہ ہے جس کا سرے سے کوئی نشان ہی نہ تھا یا نہ ہو۔ اس پر آپ نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قیامت کے دن مُردوں کے قبروں سے جی اٹھنے کے متعلق قرآن نے جیسے جدث کا لفظ استعمال فرمایا ویسے ہی قبر کا بھی فرمایا ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ زمین ہی بدل چکی ہو گی تو پھر ان میں فرق کیا ہوا؟

چنانچہ جہاں میں نے یہ فرق بتلایا تھا، وہاں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ میرا اپنا فہم ہے اور مجھے اپنے فہم کو دوسروں سے تسلیم کروانے پر قطعاً کوئی اصرار نہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس پر اہلِ لغت کا اتفاق بھی ہے کہ دو مترادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق ہوتا ضرور ہے۔ ورنہ ایک کے بعد دوسرے لفظ کے وجود میں آنے کی کوئی

وجہ نہیں۔ اب میرے اس فہم کی مزید وضاحت یوں سمجھئے کہ قبر کا لفظ عام ہے اور جدث خاص ہے۔ ہر جدث قبر ضرور ہوتی ہے مگر ہر قبر جدث نہیں ہوتی۔ امید ہے اب آپ یہ فرق اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

۵۔ سماعِ موتیٰ:

اس مسئلہ میں فاروق صاحب کا رویہ شدید اور انتہا پسندانہ ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی رُو سے سماعِ موتیٰ ثابت نہیں ہوتا تو پھر سماعِ موتیٰ کا قائل مومن ہے یا کافر؟ نیز یہ کہ قلیب بدر کے واقعہ کے فہم میں جب حضرت عائشہؓ کا مقام بلند تر ہے تو پھر جو شخص بلند تر سے کم تر کی طرف رجوع کرے اس کے متعلق آپ کا فتوای کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میں کوئی فتوای دینے کے حق میں نہیں، البتہ یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اتنے متشدد نہ ہوں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگر سماعِ موتی کے قائل تھے تو اس کا حوالہ کیا ہے؟ سو اس کے حوالہ کے لیے دیکھیے "جمع الفوائد" ج ۲، ص ۶۷۹ طبع ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء مطبوعہ مدینہ منورہ۔ الفاظ یہ ہیں:

"رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقِفُ عَلَى قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَوَاهُ مَالِكٌ"

نیز مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۵۰۵، الفاظ یہ ہیں:

"قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: "مَا نَعْلَمُ أَحَدًا عَنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَ ذٰلِكَ إِلَّا ابْنَ عُمَرَ" (رواہ عبدالرزاق)

یعنی تمام صحابہؓ میں سے صرف عبداللہ بن عمرؓ ہی رسول اللہ کی قبر پر درود پڑھتے تھے۔ دوسرا کوئی صحابی یہ کام نہ کرتا تھا۔

دوسرے مستفسر جناب سومرو صاحب نے مندرجہ ذیل تین امور کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱۔ قبر کا معنیٰ اور مقام:

اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر پیش کر چکا ہوں اور دلائل کا جائزہ بھی۔ ان میں

اس سوال کے لیے بھی وہی جواب کافی ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

۲۔ نقدِ احادیث:

اس سلسلہ میں آپ نے دو احادیث پر تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) سیاح فرشتوں والی حدیث (جو نسائی میں مذکور ہے) کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی "زاذان" ہے جو مجروح ہے اور شیعہ بھی ہے، لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔

(۲) "رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ" (ابوداؤد بیہقی) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں دو راوی ابوصخر حمید بن زیاد اور یزید بن عبداللہ بن قسیط مجروح ہیں، لہذا یہ حدیث بھی مجروح یا موضوع ہوئی۔

پھر انہی باتوں کی تحقیق کے لیے آپ نے مختلف کتب رجال سے فوٹوسٹیٹ بھی بھیجے ہیں اور مذکورہ بالا کتابوں کے فوٹوسٹیٹ بھی۔ تاکہ ان مصنفین کے تبصرہ کا بھی علم ہو سکے۔

حدیث پر تنقید کرنا ایک مستقل فن ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد تمام رواۃ کے حالاتِ زندگی اور ان کے باہمی روابط سے واقف ہونے کے علاوہ اصولِ حدیث سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہو اور یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ رجال کی کتابوں کے تبصرہ پر انحصار کر کے کسی حدیث پر تنقید کر دینا بھی غیر محتاط روش ہے کیونکہ بسا اوقات کسی ایک راوی سے متعلق تبصروں میں اختلاف ہوتا ہے، جیسا کہ خود جناب محمد حسین صاحب نیلوی نے اپنی کتاب "ندائے حق" کے ص ۱۹۵ پر خود اس بات کا اعتراف کیا ہے، وہ ابوصخر بن زیاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "اسے واقعی کئی اصحابِ جرح و تعدیل نے ثقہ لکھا ہے مگر بعض دوسرے محققین نے اس کی تضعیف بھی کی ہے۔"

اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک محدث کسی راوی کو ضعیف قرار دینے کے باوجود اس سے حدیث روایت کر جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہی حدیث بعض دوسرے طریقوں سے مذکور ہوتی ہے جس کے تمام تر رواۃ ثقہ ہوتے ہیں۔ لہذا اندریں صورتِ حال محدث اس ضعیف راوی کی روایت

کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ اسی بناء پر بریلوی صاحب کو اپنی کتاب "ندائے حق" کے ص ۱۹۵ پر یہ فقرہ بھی لکھنا پڑا کہ کسی راوی کے متعلق "صرف اتنا کہہ دینا کہ صحیح مسلم کا راوی ہے لہٰذا قوی ہے مبنی بر جہل ہے"۔ (یہ فقرہ یزید بن عبداللہ بن قسیط پر تبصرہ کے ضمن میں آپ نے لکھا ہے) پھر اس صورتِ حال میں کسی مسئلہ کے مخالف و موافق دونوں، کھینچ تان کر کے اپنا اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا مسلکِ اعتدال یہی ہے کہ انسان غیر جانبدار ہو کر ان کتب کی طرف رجوع کرے اور اس سے زیادہ محتاط مسلک یہ ہے کہ کسی محدث کے تبصرہ پر قناعت کرے۔

لہٰذا ہم ان دونوں احادیث کو موضوع کہنے کے حق میں نہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ضعیف روایات ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور ضعیف روایت تائید کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ البتہ جب ایسی حدیث اپنے مضمون میں منفرد ہو تو اس سے احتجاج درست نہیں، بالخصوص اعتقادات میں!

اور یہ تبصرہ بھی ہم نے ان مصنفین حضرات کی تحقیق کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے ورنہ بہت سے محدثین سیاح فرشتوں والی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۷۹ حدیث ۹۵۷۵ (مطبوعہ مدینہ منورہ طبع ۱۳۸۱ھ) الفاظ یہ ہیں:

(۱) "رَوَاهُ اَيْضًا اَحْمَدُ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ، وَاَقَرَّهُ الذَّهَبِيُّ وَقَالَ الْهَيْثَمِيُّ رِجَالُهُ رِجَالُ الصَّحِيْحِ وَ قَالَ الْعِرَاقِيُّ الْحَدِيْثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ دُوْنَ قَوْلِهِ سَيَّاحِيْنَ، كَذَا فِي الْفَيْضِ۔"

"اس حدیث کو احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا اور اُسے صحیح کہا، اور ذہبی نے اس روایت کو پائیدار سمجھا اور ہیثمی نے کہا کہ اس کے تمام راوی صحیح ہیں اور عراقی نے کہا کہ یہ روایت "سیاحین" کے لفظ کے علاوہ متفق علیہ ہے۔ ایسا ہی فیض القدیر شرح جامع الصغیر میں بھی لکھا ہے۔"

(۲) "رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ" والی روایت کو سیوطی نے ضعیف قرار دیا ہے۔"

(جامع الصغیر ج ۲ ص ۱۴۸) تاہم موجودہ دور کے محدث البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ گویہ حدیث صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ تاہم حسن ہے ضعیف نہیں۔

ان تبصروں کے بعد اس تیسرے طبقہ کے حضرات کے تبصروں کو سامنے لائیے، تو خود بخود یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلے انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہیں۔ پھر ایسی احادیث کو مجروح یا موضوع ثابت کرنے کے لیے اعتدال کی راہ سے ہٹ کر کھینچ تان سے کام لیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ:

"قرآن سماع موتٰی کی پرزور تردید کرتا ہے، احادیث صحیحہ استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی روایات اس کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگوں کے اقوال اور فرامین قرآن کا رد پیش کرتے ہیں۔"

۳۔ تاویلِ حدیث:

سومرو صاحب لکھتے ہیں کہ:

"احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ "مُردہ کو جب کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے تو وُہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو....." اس حدیث سے بھی تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حدیث کا بعینہٖ وہی مطلب نہیں ہوتا جو اس کے ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس اشکال والی حدیث کا، کسی دوسری اشکال والی حدیث کو ملحوظ رکھ کر مطلب سمجھا جائے گا۔"

پھر مثال کے طور پر جو دوسری اشکال والی حدیث آپ نے درج فرمائی وُہ یہ ہے کہ:

"بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا تقرّب حاصل کر لیتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تا آنکہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وُہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وُہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وُہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وُہ چلتا ہے۔"

یہ حدیث درج کرنے کے بعد سومرو صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی وحدت الوجودی یا حلولی یہ کہہ دے کہ خدا تو خود کہتا ہے کہ میں اس کے اعضاء بن جاتا ہوں تو کیا اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ اس کے یہ معنی نہیں، یہ تو اندازِ بیان ہے؟"

غور فرمائیے کہ اگر کسی ایسے صوفی کو یہ کہا جائے کہ یہ تو محض اندازِ بیان ہے تو کیا وُہ آپ کے اس جواب سے مطمئن ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، صرف اندازِ بیان کہنے سے وُہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا، بلکہ اس کے اطمینان کے لیے اسے حدیث کا مطلب سمجھانا پڑے گا اور اسی حدیث کے مطلب میں نظریہ حلول کا پُورا رد موجود ہے اور وُہ یہ ہے، کہ حلولی یا وحدت الوجودی عبد اور معبود ہونے کا قائل نہیں ہوتا۔ وُہ اپنے آپ کو خدا کا ایک حصّہ اور اس کا ہمسر تصوّر کرتا ہے جبکہ یہ حدیث شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ "جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے"۔ گویا عبد اور معبود کا تصوّر ہی اس حدیث کی بنیاد ہے۔ رہا اس کے اعضاء کا اللہ کے اعضاء بن جانے کا مسئلہ، تو اس کو جب پہلے حصّہ سے متعلق کیا جائیگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس بندہ کے اعضاء سے منشائے الٰہی کے خلاف کوئی کام صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو کچھ خدا چاہتا ہے وہی کچھ اس کے اعضاء کرنے لگتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس بندے کے اعضاء پر منشا و رضائے الٰہی اتنی محیط ہو جاتی ہے کہ منشائے الٰہی کی تنفیذ کے لیے اس کے اعضاء آلہ کار کا کام دینے لگتے ہیں اور یہی عبودیت کا بلند مقام ہے جو حلولی اور وحدت الوجودی نظریّہ کی عین ضد ہے۔ حلولی نظریہ میں عبادت کیسی اور تقرب الی اللہ کیسا؟ پھر اس حدیث کے اگلے الفاظ یوں ہیں:

"وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ"

(بخاری کتاب الرّقاق)

"اور اگر وہ (میرا مقرب بندہ) مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں پناہ دیتا ہوں۔"

گویا اس حدیث کا پہلا حصّہ بھی عبد اور معبود کے تعلق کو واضح کر رہا ہے اور آخری حصّہ بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے تو پھر ہمیں اس حلولی کو محض اندازِ بیان کہہ کر مطمئن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں تو اس حدیث سے اس کا پورا پورا رد کرنا

چاہیے اور یہ بھی بتلا دینا چاہیے کہ اس سیاق و سباق کے درمیان والی عبارت کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے نہ وہ جو تم سمجھ رہے ہو۔ پس یہ محض اندازِ بیان نہیں ، اس حدیث کے درج کرنے سے غالباً آپ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جیسے اس اعضاء والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے ، اسی طرح اس مردے کے کلام کرنے والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے۔ اور وہ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو مردہ کے ہونٹ ہلتے دیکھتے ہیں ، نہ ہی اس کی آواز سنتے ہیں۔ مگر ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردہ بولتا ہے۔ اسی طرح عذاب قبر کے سلسلہ میں جو قبر کا ظاہری لفظ ہے۔ اس سے مراد زمینی گڑھا لینا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں ہمیں اس مردہ کے بولنے والی حدیث میں بھی کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ہم اس کا کلام سن یا سمجھ نہیں سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

" وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ " (بنی اسرائیل ۴۴)

" کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ حمد بیان کرتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں "

تو جب ہم اتنی کثیر التعداد اشیاء کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے ، اور ہمارے اس نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ تو ان کی تسبیح میں کوئی فرق آتا ہے نہ ہمیں اس کی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر اگر ہم ایک مردے کی بات سن یا سمجھ نہ سکیں تو آخر اس مفر کی صورت اختیار کرتے ہوئے تاویل کی راہ کیوں سوچیں؟ اور قبر کا معاملہ تو اس سے بھی خاص ہے۔ قبر ایک مادی اور حسی چیز ہے۔ قبر کا لفظ بولنے سے فوراً ہر کوئی سمجھ جاتا ہے ، اور ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے ، تو پھر آخر اس قبر کو زمینی قبر ہی سمجھ لینے سے کیا چیز مانع ہے؟

ماحصل

مستفسرین کے سوالات و اشکالات کا جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے نظریہ کی ایک بار پھر وضاحت کر دوں جو اس طرح ہے :

۱۔ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہی کچھ رسول اللہ اور صحابہؓ نے سمجھا تھا۔

۲۔ قبر کی نئی تعبیر کہ اس سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برزخی قبر ہے ، مابعد کی پیداوار ہے جو تفریط یا دوسری انتہا ہے اور یہ غالباً شرک کے اس چور دروازہ کو بند کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۳۔ مرنے کے بعد روح کو نیا جسم عطا نہیں ہوتا بلکہ روح کا اپنا بھی جسم اور شکل ہوتی ہے اور یہ اس دنیوی زندگی میں بھی ہے۔ خواب میں یہی شکل و صورت ہوتی ہے اور یہ شکل و صورت

مرحلہ ۱ میں بھی تھی۔ اور اس کی شکل و صورت انسان کے ظاہری جسم کی شکل و صورت جیسی ہی ہوتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے زیتون کے درخت میں زیتون کا تیل یا کوئلہ میں جلنے والی گیس یا آگ۔

۴۔ مرنے کے فوراً بعد ہی رُوح کو عذاب و ثواب سے دوچار ہونا پڑتا ہے خواہ ابھی مُردہ دفن نہ ہوا ہو اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

۵۔ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردہ کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکتا ہے۔ اس وقت اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور وُہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی چاپ بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطراری امور ہیں۔ ان میں استثناء یہ ہے کہ جن لوگوں کو قبر نصیب ہی نہ ہو ان پر یہ واردات صرف روح پر ہی واقع ہوتے ہیں۔

۶۔ کبھی کبھار اس رُوح کے عذاب و ثواب کا خفیف سا اثر اس جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے جو قبر میں دفن ہوتا ہے (اگر ہو تو) جیسا کہ خواب میں انسان کی رُوح تو رنج و راحت سے متاثر ہوتی ہی ہے، لیکن کبھی کبھار اس کا اثر انسان کے بستر پر پڑے ہوئے اور سوئے ہوئے جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۷۔ جس طرح سونے والے شخص کے خواب میں دنیا اور جہان اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتے ہیں اور وُہ جاگنے والوں کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے اسی طرح مرے ہوئے انسان کی بھی دنیا جہان، اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتی ہے اور وُہ ان کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے لہٰذا قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ مُردے جو قبروں میں مدفون ہیں اور اسی طرح ان کی روحیں بھی، ہم دنیا والوں کی آواز یا فریاد قطعاً سُن نہیں سکتے اور اس میں استثناء یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو کسی کو سنا بھی سکتا ہے۔

۸۔ ایسے سوالات یا اشکالات، کہ خواب میں ایک انسان کی رُوح کسی مرے ہوئے کی رُوح یا زندہ کی رُوح سے کیسے ملتی ہے؟ ان کا حل تلاش کرنا انسانی عقل سے ماورا ہے۔ ان کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں نہ ہی ایسی باتوں کا عقائد سے کچھ تعلق ہے۔

۹۔ رسولؐ اللہ پر جہاں کہیں سے بھی درود پڑھا جائے وُہ فرشتوں کے ذریعہ ان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

۱۰۔ عالم برزخ فی الحقیقت موت کا عالم ہے کیونکہ اس میں رُوح اور جسم کا انفصال ہوتا ہے لیکن اس میں بھی استثنائی صورت موجود ہے تاہم اس میں موت کے اثرات ہی غالب رہتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں، جو کہ عالم حیات ہے، استثنائی صورت خواب ہے اور اس خواب میں حیات کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم علمہٗ اتم و حکمہٗ احکم!



ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ

مراسلات

(۲)

متعلقہ

روح، مقامِ قبر اور سماعِ موتیٰ

(یہ جوابات محدث کی دو اقساط ربیع الاوّل اور ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)

محدث جون ۱۹۸۴ء میں "مراسلات" کے عنوان سے میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس سے متعلق دو حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں ایک تو ہی پرانے کرمفرما جناب سومرو صاحب ہیں اور دوسرے اشفاق صاحب ناظم آباد کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب سومرو صاحب نے کیپٹن مسعود الدین عثمانی صاحب کا پورا لٹریچر بھی مجھے مطالعہ کے لیے بھیج دیا ہے اور استدعا کی ہے کہ میں اس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے آگاہ کروں۔ عثمانی صاحب کا لٹریچر تو میں پہلے بھی سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ اب نظرِ ثانی کا موقع مل گیا۔ جبکہ اشفاق صاحب کا خط خاصا طویل ہے۔ اسے خط کے بجائے عتاب نامہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ حضرت عثمانی صاحب کے نہایت شیدائی اور ان کے مخصوص نظریات میں عثمانی صاحب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں۔ خط کا لب ولہجہ نہایت تند و تیز ہے۔ ہر وہ محدث، امام یا عالمِ حدیث جو انھیں اپنے مخصوص نظریات کے خلاف نظر آیا، کھلے دل سے اور ٹھوک کے حساب سے انہیں بدعقیدہ، گمراہ اور کافر و مشرک قرار دے دیا ہے۔

علمی مسائل کی تحقیق میں یہ انداز قطعًا غیر مناسب ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف

ہو جانا ایک فطری امر ہے، لیکن جب اس میں اس قسم کا تشدد تعصب پیدا ہو جائے تو یہی چیزاتیں اختلاف اور تفرقہ بازی کی بنیاد بن جاتی ہے جسے قرآن نے شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ اشفاق صاحب کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جس جرم کی پاداش میں وُہ دوسروں کو کافر و مشرک قرار دے رہے ہیں، خود کہیں اس سے بڑے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ہیں؟ بالخصوص اس صورت میں جبکہ رسُول اللہ کا یہ واضح ارشاد موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے، تو اگر وُہ کافر نہیں تو کہنے والا ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تکفیر بازی سے حتی الوسع پرہیز لازم ہے۔

اب قرآن کا اندازِ بیان ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کا کھلا ہوا شرک ——— حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ کہنا اور عیسائیوں کا تین خداؤں کا عقیدہ رکھنا ——— بیان کرنے کے باوجود انہیں مشرک نہیں کہا بلکہ اکثر مقامات پر اہلِ کتاب ہی کہا ہے۔ لہٰذا میں اشفاق صاحب کی بجائے عثمانی صاحب سے گزارش کروں گا کہ وُہ اپنے متبعین کو ہدایت کریں کہ علمی مسائل کی تحقیق میں فروتر باتوں پر اتر آنے کے بجائے علمی انداز ہی اختیار کیا کریں۔

اشفاق صاحب کے اس طویل خط میں تمام کے تمام اقتباسات عثمانی صاحب کے لٹریچر ہی سے دیے گئے ہیں۔ لہٰذا ہم اس خط کو بعینہٖ چھاپ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف قارئین کو عثمانی صاحب کے لٹریچر کا خلاصہ معلوم ہو جائے گا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرات ان نظریات کے مخالفین کے لیے کیسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ خط بجنسہٖ درج ذیل ہے:

اشفاق صاحب کا عتاب نامہ:

مکرمی و محترمی مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب السلام علیکم۔

محدث جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں مراسلات کے عنوان سے آپ نے رُوح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ سے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس میں چند باتیں میرے فہم سے بالاتر ہیں۔ امید ہے کہ آپ اگلی اشاعت میں میرے ان اشکالات کا واضح جواب شائع فرمائیں گے ——— مشکور ہوں گا۔

۱۔ دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد یہی گڑھا لیا ہے جو صحیح

نہیں ۔ دراصل ہر مرنے والے کو قرآن کے فرمان کے مطابق (ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ) قبر ملتی ہے ۔ چاہے اس کو مچھلیاں ہی ہڑپ کر گئی ہوں ۔ یہی اصل قبر ہے جہاں روح کو دوسرے برزخی جسم میں ڈال کر قیامت تک رکھا جائے گا ۔ اور اس پر راحت یا عذاب کا پورا زمانہ گزرے گا ۔

بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵ میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی ؐ نے فرمایا کہ میں نے عمرو ابن الحی الخزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتوں کو کھینچ رہا تھا ۔ اسی طرح بخاری جا ص ۱۸۵ میں سمرہ بن جندب ؓ کی طویل روایت موجود ہے ، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ روحوں کو جسم برزخی ملتا ہے اور روح اور اس برزخی جسم کے مجموعے پر راحت و عذاب ہوتا رہے گا ۔ یہ عذاب کا سلسلہ تا قیامت چلے گا ۔ یہ برزخی جسم ایسا ہے کہ اگر اس کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ پھر بن جاتا ہے ۔ دنیا میں زنا کاروں کی قبریں مختلف ملکوں میں ہوتی ہیں مگر برزخ میں ان کو ایک ہی تنور میں برہنہ حالت میں جمع کر کے آگ کا عذاب دیا جاتا ہے ، اسی طرح بخاری جلد ا ص ۸۴ پر براء بن عازب ؓ سے روایت موجود ہے کہ جب ابراہیم ؑ کی وفات ہوئی تو رسول ؐ نے فرمایا : کہ ان کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے ۔ اسی طرح شہداء کے لیے مسلم جلد ۲ ص ۱۳۵ میں روایت عبداللہ بن مسعود ؓ سے آئی ہے کہ رسول ؐ نے ارشاد فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز اڑنے والے قالبوں میں ہیں ۔ اور ان کے لیے قندیلیں عرش الٰہی سے لٹکی ہوئی ہیں ۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء ، عام مومن ، کافر ، مشرک سب ہی کو ایک برزخی جسم ملا ہے اور وہی اُس کے لیے برزخی قبر ہے عذاب اور ثواب کا سارا معاملہ اسی برزخی جسم کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ یہ گڑھا جس کو غلطی سے آپ نے بھی قبر کا نام دے دیا ہے اور نہ اس عنصری جسم کو عذاب اور ثواب سے کوئی تعلق ۔

آپ نے اس گڑھے کو قبر ثابت کرنے کے لیے جو چند احادیث تحریر فرمائی ہیں ان کا جواب یہ ہے :

قبروں پر ٹہنیاں لگانے سے متعلق بخاری کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور

تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی لیے آپؐ نے شاخیں لگا کر برزخی عذاب سمجھا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مُردے دفن کیے گئے تھے ان پر برزخ میں یہ حالات گزر رہے ہیں۔ یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اس حدیث کی آپ نے من مانی تشریح کر کے یہ بات نکال لی کہ انہی دنیاوی قبروں میں دنیاوی جسموں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ بڑی گستاخی ہے اور نبیؐ پر کتاب اللہ کے جھٹلانے کا غلط الزام ہے۔

نبیؐ کو کتاب اللہ کی تشریح اور تائید کے لیے بھیجا گیا تھا جھٹلانے کے لیے تو نہیں۔

اسی طرح بعض لوگ مسلمؒ کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس میں قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے نبیؐ کا خچر بدکا۔ اور اس سے یہ دلیل نکالی جاتی ہے کہ مشرکوں پر ان ہی دُنیاوی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے جس کی چیخ و پکار کو سُن کر خچر بدکا۔ ذرا سوچیے، کتنے خچر، گھوڑے، گدھے آج بھی قبرستانوں میں گھومتے رہتے ہیں، ایک بھی نہیں بدکا۔ دراصل یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اور اس خاص واقعہ کے ذریعے نبیؐ نے کفار پر برزخی عذاب، جو اُن کو برزخی قبر اور برزخی جسم میں دیا جا رہا تھا، صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں محفوظ فرما دیا۔ مسلم کی ایک روایت جو جلد ۱ صفحہ ۳۰۹ پر موجود ہے جس میں نبیؐ نے قبر پر نماز ادا فرمائی۔ بخاری کے حوالے سے آپ نے جس کو ان ہی دنیاوی قبروں کے لیے دلیل بنایا۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ قبریں اپنے اہل پر اندھیروں سے بھری رہتی ہیں۔ میری دُعا سے اللہ تعالیٰ انہیں منور کر دیتا ہے۔ اگر اس روایت سے جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے اور دُوسروں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے دنیاوی قبر مراد لی جائے تو ایک ایک قبر میں بے حساب مُردے دفن ہوتے ہیں۔ کوئی اچھا کوئی بُرا ہر ایک کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا۔ اس کے بجائے اصل سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس گڑھے کو قبر اور اس میں سوال و جواب کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے

مسلم کے حوالے سے عمرو بن عاصؓ کی مرتے وقت وصیت پیش کی جاتی ہے۔ اوّل تو مسلم کی اس روایت پر امام نوویؒ نے جرح کی ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن میں کلام کیا گیا ہے۔ دیکھیے شرح مسلم نووی ج ا ص ۷۶۔ مزید یہ کہ اس کے راوی ابو عاصم ضحاک ابن مخلد کو عقیلی کتاب الضعفاء میں لائے ہیں۔ دیکھیے الضعفاء للعقیلی ص ۱۷۱۔ میزان اعتدال جلد ۲ ص ۳۲۵

دوسرے یہ کہ یہ سکرات الموت کی بات ہے، جیساکہ حدیث میں ہے "وھو فی سیاق الموت" ایسے وقت کی بات ہے جب آدمی اپنے آپے میں نہ ہو۔ قرآن اور حدیث کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ آخر لوگ واقعہ قرطاس کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپؐ پر مرض کی شدت کی وجہ سے بحرانی کیفیت طاری ہے۔ اسی کے زیرِ اثر آپؐ یہ فرما رہے ہیں، اس لیے لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ذیل میں لوگ بریدہ اسلمیؓ کی وصیت پیش کرتے ہیں جو بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱ پر موجود ہے۔ یہ بھی ان کی وصیت ہے۔ جس کا کیا اعتبار؟ جیسے آپ نے ماحصل کے ذیل ۵ صفحہ ۲۱۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ "مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردے کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکتا ہے۔ اس وقت اس سے سوال اور جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی چاپ بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطراری امور ہیں۔ ان میں استثناء یہ ہے کہ جن لوگوں کو قبر نصیب نہ ہو ان پر یہ واردات صرف رُوح پر ہی واقع ہوتے ہیں"، گویا کہ آپ بھی ردِ رُوح والی روایتوں کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ روایتیں سنداً ضعیف اور نص قرآنی کا انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ آپ کے عقیدے کے مطابق مُردہ کے دفن ہوتے ہی رُوح واپس آ جاتی ہے۔ گویا مُردہ مُردہ نہ رہا۔ قبر میں پھر زندہ ہو گیا جو قرآن کے خلاف ہے۔ پھر یہ رُوح آخر دوبارہ واپس گئی بھی یا نہیں؟ اگر آسمانوں میں اُوپر واپس چلی گئی تو اس کے لیے آپ کے پاس حدیث کی کونسی دلیل ہے؟ دراصل یہ فتنہ نیا فتنہ نہیں بلکہ اس کے بانی مبانی احمد بن حنبل ہیں جو ردِ رُوح کے قائل ہیں۔ جیساکہ کتاب الصلوٰۃ

ص۳۵ طبع قاہرہ میں تحریر ہے :

"پھر ارواح کے قبروں میں جسموں کی طرف لوٹائے جانے پر ایمان لانا ضروری ہے۔"

ان الفاظ کو پڑھیے اور احمد بن حنبل کی بدعقیدگی پر سر دھنیے۔ اب بتائیے کون شخص احمد بن حنبل کو مسلمان سمجھ سکتا ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ہی اس بدعقیدگی کو معاشرہ میں رائج کیا اور امتِ مسلمہ آج تک جس کی سزا بھگت رہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مرنے کے بعد صرف قیامت کے دن ہی انسان زندہ ہو گا۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۔ سورۃ المومنون ۱۵، ۱۶ اسی طرح سورۃ البقرۃ ۲۸

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

اسی طرح سورۃ المومن ۲۴ پ ۱۱ میں ہے۔ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝

محترم سوچیئے دو زندگیوں اور دو موتوں کے بعد تیسری زندگی اور تیسری موت کہاں سے آئی؟ آپ نے تو قبر میں رُوح پلٹا کر ایک تیسری زندگی کا جواز نکال دیا۔ جو کھلا قرآن کا انکار ہے۔

اس تضاد کو دُور کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو ایک برزخی جسم ملتا ہے اور وُہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔

مکرمی آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وُہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی چاپ بھی سنتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ دراصل یہ چاپ آدمیوں کی نہیں بلکہ فرشتوں کی ہوتی ہے جیسا کہ بخاری کے شارح ابن المنیر کی شرح ہے جس کو ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لائے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے :

ابن حجر عسقلانی نے کہا کہ بخاری کے اس باب باندھنے کہ (المیت یسمع قرع النعال - یعنی مردہ جوتوں کی چاپ سنتا ہے) کے متعلق الزین بن المنیر نے کہا کہ مصنّف (بخاری) کے اس مضمون کے باب باندھنے سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اس طریقہ کو آداب دفن میں اولیت حاصل ہے - کہ وقار برقرار رکھا جائے - شور وشر سے اجتناب کیا جائے - اور شدت کے ساتھ پیروں کو نہ مارا جائے - جیسے کہ ایک زندہ سونے والے کے لیے ہونا چاہیے اور ایسا لگتا ہے کہ بخاری نے (نبیؐ کے الفاظ سے) یہ نکالا ہے کہ آدمیوں سے جیسا کچھ سنا جاتا ہے ویسا ہی فرشتوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ (یعنی اُن کے جوتوں کی آواز)

شاید آپ کا دوسروں کی طرح یہ عقیدہ بھی ہے کہ رُوحیں علیین اور سجین میں رکھی جاتی ہیں - یہ بات بھی صحیح نہیں ہے - کیونکہ علّیین اور سجین روحوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ نیکوں کاروں اور بدکاروں کے اعمالناموں کے دفتر ہیں - جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَمَا اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ سورۃ المطففین (آیت ۸تا۱۰)، اور كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ صرف یہی نہیں بلکہ گمراہ لوگ سورۃ اعراف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ " ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات جھٹلاتے ہیں اور ان سے استکبار کرتے ہیں آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے " جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن کی ادیبانہ زبان ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کی دعائیں اور خود ان کی ہرگز پذیرائی نہ ہوگی - ایک دلیل کلام المیت علی الجنازۃ کی بھی پیش کی جاتی ہے - تو ظاہر ہے کہ یہ مردہ ہے - زندہ تو نہیں بہرحال اس کا بولنا قرآن کے متشابہات کی طرح ہے - اور اس حدیث کی اصل تاویل کسی کے پاس نہیں ورنہ اگر کاندھے کے پاس بولے تو اٹھانے والا کیوں نہ سنے گا۔

ہم نے آپ کے مضمون کے پیش کردہ دلائل کا بھی تجزیہ کیا - اور ان دلائل کی بھی اصل حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی - جو اس ذیل میں بارہا پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اب آپ کا فرض ہے کہ یا تو آپ رجوع فرمالیجیے یا پھر ہمیں کتاب وسنت کی روشنی میں مطمئن کرنے کی کوشش کیجیے۔

امام احمد، امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، ابن کثیرؒ ابن حجر اور ایک جم غفیر ہے۔ جو مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے رُوح کے واپس آجانے کا قائل اور اسی دنیاوی قبر میں قیامت تک مُردہ پر عذاب یا راحت کے سارے احوال گزرنے کا اقراری ہے۔ دراصل یہی عقیدہ ان سب بڑوں کو کافر اور مشرک بناتا ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے دوسری طرف قرآن اور احادیث صحیحہ اجماع صحابہ امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ ہیں جن کا فیصلہ یہ ہے کہ رُوح بدن سے نکلنے کے بعد مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے واپس نہیں آسکتی ہے۔

اور نہ دنیاوی جسم سے اس کا کسی قسم کا تعلق باقی رہتا ہے اور یہ قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں، ان میں جان کی رمق تک نہیں ہوتی۔

امت کی بدنصیبی ہے کہ آج کیفیتِ عذابِ قبر کے اس عظیم مسئلہ کو فروعی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایمان باللہ ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول کا معاملہ ہے۔ جو بھی یہ عقیدہ رکھے کہ دنیاوی قبر کے مُردے میں رُوح واپس آجاتی ہے۔ اسی کو اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے۔ سوال اور جواب ہوتا ہے۔ اور اب اسی پر قیامت تک دنیاوی قبر میں راحت کا دور جاری رہے گا۔ وُہ ایمان سے خالی ہے۔

امید ہے کہ پہلی فرصت میں آپ زحمت فرماتے ہوئے تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں گے۔"

والسلام (اشفاق)

جوابات

اس خط کے لب و لہجہ سے ہٹ کر اگر خالص علمی محاسبہ کیا جائے تو میرے خیال میں اختلافی مسائل صرف دو ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱۔ قبر کا صحیح مقام کونسا ہے؟ زمینی گڑھا، جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے یا برزخی قبر۔

۲۔ سماعِ موتیٰ میں کوئی استثنا بھی ہے یا نہیں؟ بالفاظِ دیگر کسی نہ کسی وقت اعادۂ روح کا امکان ہے یا نہیں؟

میں اس بحث میں خاص اختصار پیدا کرنے کی خاطر یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث

کو صرف قرآنِ کریم اور بخاری شریف تک محدود رکھوں۔

(۱) مقامِ قبر؟

مقامِ قبر کے متعلق آپ کا نظریہ یہ ہے کہ وُہ مقام، جہاں میت کو عذاب و ثواب ہوتا ہے، یہ زمینی گڑھا نہیں بلکہ کوئی برزخی مقام ہے جسے آپ برزخی قبر کہتے ہیں۔ یا برزخی قبر سے وُہ نیا جسم مراد ہے جو میت کی رُوح کو مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظریہ کا کتاب و سنّت میں کہیں ذکر نہیں۔ صرف استنباطات کے ذریعہ اسے کشید کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ محض ایک نظریہ ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ بخلاف عقیدہ کے کہ اس کی بنیاد قطعی نصوصِ شرعیہ یا بالفاظِ دیگر کتاب و سنّت کے واضح الفاظ پر ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی سامنے رکھیے کہ نظریہ وُہ ہوتا ہے جس کی صحت کو مختلف نتائج یا استنباطات کے ذریعے جانچا جاتا ہے جبکہ عقیدہ وُہ ہوتا ہے جس کی اپنی حیثیت مسلّم اور برقرار ہوتی ہے اور اس سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے!

اب دیکھیے "برزخی قبر" کا ثبوت قرآن یا کسی صحیح حدیث سے ملنا تو درکنار، علمائے متقدمین کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ محض ایک نظریہ ہے، عقیدہ نہیں۔ پھر اس نظریہ کے نہ ماننے کی وجہ سے کسی کو بدعقیدہ، گمراہ یا مشرک و کافر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، جیسا کہ اشفاق صاحب نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ،

"دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد یہی گڑھا لیا ہے جو صحیح نہیں۔" (آپ کا خط ص ۱)

اور عجب بات یہ ہے کہ خود اشفاق صاحب کو بھی اس برزخی قبر کے محض ایک نظریہ ہونے کا اعتراف ہے۔ چنانچہ وُہ اس خط کے ص ۴ پر لکھتے ہیں:

"اس کے بجائے اصلی سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اشفاق صاحب کے یہ الفاظ ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں کیونکہ اگر یہ "اصل سچائی" کتاب و سنّت میں مذکور ہوتی تو آپ کو اس کے مان لینے کے لیے ایسی التجا کرنے کی ضرورت

قطعاً پیش نہ آتی۔

پھر اسی خط کے ص ٦ پر یُوں رقمطراز ہیں :

"اس تضاد (یعنی اشفاق صاحب کا اپنا ذہنی تضاد، جس کا آگے چل کر جواب دے دیا گیا ہے) کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو ایک برزخی جسم ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب وثواب کے تمام احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے"

اشفاق صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اس "اصل سچائی کو مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا" حالانکہ اس "اصل سچائی کو ماننے سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ جب میت کو مرنے کے ساتھ ہی ایک نیا جسم مل گیا، جو کم از کم یوم البعث تک قائم ودائم اور عذاب و ثواب سے دوچار رہے گا۔ تو اس رُوح اور جسم کے اتصال ہی کا نام تو زندگی ہے۔ آخر یہ مستقل اور دائمی زندگی کہاں سے آگئی ؛ جبکہ قرآن میں صرف دو زندگیوں کا ذکر آیا ہے ؛ اسی طرح اس مستقل اور دائمی زندگی میں مسلسل عذاب کا نظریہ بھی درست نہیں۔ قرآن میں تو اس برزخ کے عرصہ میں فرعون اور آلِ فرعون جیسے کافروں کے لیے بھی "اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا" کے الفاظ آئے ہیں جو عذاب کے تسلسل کو ختم کر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ نظریہ صحیح کیسے ہوا؟

برزخی جسم :

اس کے بجائے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ رُوح کو کوئی نیا جسم نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا اپنا بھی جسم ہوتا ہے۔ فرشتے جب کسی مرنے والے کی رُوح کو نکالتے ہیں تو یہ رُوح اپنی جسمیت سمیت مادی جسم کے بند بند سے نکلتی ہے۔ پھر فرشتے اسی جسمیت سمیت روح کو کپڑے میں لپیٹ کر آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور رُوح کا یہ جسم مادی جسم میں اسی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے، جیسے کوئلہ میں جلنے والی گیس یا زیتون کے درخت میں روغنِ زیتون۔ رُوح کا یہ جسم مرحلہ ١ میں بھی موجود تھا۔ جب "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کا سوال و جواب ہوا۔ مرحلہ ٢ میں، ٣ میں اور ٤ میں بھی غرض ہر مرحلہ پر رُوح کا جسم اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ البتہ مرحلہ ٢ اور ٤ میں اسے ایک اضافی مادی جسم بھی ملتا ہے اور اسی اضافی جسم کی وجہ سے ان ہر دو ادوار کو زندگی کے ادوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رُوح کے اسی اپنے جسم کی وجہ سے ہم خواب میں ایک

دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح رُوح کا یہی جسم خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح عرصۂ برزخ میں یہی جسم عذاب و ثواب سے دوچار ہوگا۔ رُوح کے اس جسم کو آپ نیا برزخی جسم کہہ لیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ وسنہ رُوح کا اپنا مستقل جسم ہوتا ہے۔ جس کا عرصۂ برزخ سے چنداں تعلق نہیں۔

رُوح کا یہ جسم سنتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ لیکن اس کا یہ بولنا اور سننا ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں جو کچھ کہتا یا سنتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے جاگنے والے شخص کو اس کی گفت و شنید کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں کا عالم بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔

پھر جس طرح خواب میں کوئی شخص انتہائی تکلیف یا انتہائی انبساط میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات بعض دفعہ بستر پر لیٹے ہوئے جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح عرصۂ برزخ میں عذاب و ثواب سے دوچار ہونے والی رُوح پر جب شدت گزرتی ہے تو اس کے اثرات قبر میں پڑے ہوئے جسم تک بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جسم موجود ہو تو، ورنہ نہیں۔ گو یہ استثنائی صورتیں ہیں، مگر ان سے انکار ممکن نہیں۔ عام قانون یہی ہے کہ جس طرح خواب دیکھنے والے شخص کے رنج و راحت سے اس کا بستر پر پڑا ہوا جسم دوچار نہیں ہوتا، اسی طرح عرصۂ برزخ میں رُوح اور جسم پر جو واردات گزرتے ہیں قبر میں پڑا ہوا جسم اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

کیا علیین اور سجین برزخی مقام ہیں؟

اشفاق صاحب اور اسی طرح عثمانی صاحب کا خیال ہے کہ علیین اور سجین برزخی مقامات نہیں بلکہ وہ صرف رجسٹر ہیں جن میں اہلِ جنت اور اہل النار کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جہاں علیین اور سجین کا ذکر آیا ہے۔ ساتھ ہی "کتابٌ مرقوم" کے الفاظ سے علیین اور سجین کی صفت بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا برزخی مقام دراصل رُوح کا وہ نیا جسم ہی ہے جو اسے مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس نظریہ سے بھی اختلاف ہے کیونکہ جہاں کہیں بھی یہ رجسٹر اندراجات ہوں گے وہ کوئی مقام ہی ہوگا۔ پھر جہاں قرآن میں علیین کا ذکر آیا ہے۔ وہاں

"کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ" کے ساتھ "یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ" کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی جس مقام پر اہلِ جنت کا یہ رجسٹر ہے، وہاں مقرب لوگ (مرے ہوئے نیک لوگ یا مقرب فرشتے) بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں سجّین کا ذکر آیا ہے وہاں "کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ" کے ساتھ ہی "وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی اس اندراج کے دن ہی سے ان جھٹلانے والوں کی ہلاکت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت حال علیّین اور سجّین مقام نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ایسے مقامات ہیں جہاں صرف اہلِ جنۃ اور اہل النار کے نام ہی درجِ رجسٹر نہیں کیے جاتے، بلکہ وہی مقام ان روحوں کا اصل مستقر بھی قرار پایا ہے۔ اور انہی مقامات پر وہ عرصۂ برزخ میں عذاب و ثواب سے تا قیامت دوچار ہوتے رہیں گے۔

قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

میں نے اپنے سابقہ مضمون "مراسلات" میں قبر سے مراد اسی زمینی گڑھا ہونے کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے سات دلائل دیے تھے جو یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو عبداللہ بن ابی منافق کے متعلق خطاب کرتے ہوئے فرمایا، "وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ" اب ذرا سچ بتائیے کہ یہاں قبر سے مراد اللہ تعالیٰ نے یہی زمینی گڑھا لیا تھا یا آپ کی مزعومہ برزخی قبر؟ نیز خود رسول اللہ اور آپؐ کے صحابہؓ نے قبر کے لفظ سے یہ زمینی گڑھا مراد لیا تھا یا برزخی قبر؟ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ کو اس منافق کی اس زمینی قبر پر کھڑا ہونے کو کیوں ناپسند کیا تھا؟

۲۔ رسول اللہ کا مقتولین قلیبِ بدر کو وہاں پہنچ کر مخاطب کرنا۔ اگر یہ کنواں ان مشرکین کی حقیقی قبر نہ تھا تو آپؐ وہاں گئے کیوں تھے؟ جہاں پہلے موجود تھے، وہیں سے ان برزخی قبر والوں کو مخاطب کر لیا ہوتا؟

۳۔ رسول اللہ کا جنت البقیع میں جا کر شہدائے احد کے لیے دعا کرنا اور

۴۔ آپؐ کا قبرستان میں یعنی انہی زمینی گڑھوں کے پاس جا کر مردوں کو "السلام علیکم" کہنا اور ان کے لیے دعا کرنا۔ آخر آپ گھر بیٹھے ہی السلام علیکم کیوں نہیں کہہ لیتے؟ کیونکہ ان کا قبرستان سے تو کوئی تعلق ہے نہیں وہ تو برزخی قبروں میں رہتے ہیں۔

۵ تا ۷ - بخاری شریف سے تین احادیث بمعہ متن، ترجمہ اور حوالہ جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ "قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے"، کو ہی ہم "اصل سچائی" قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے مقابل برزخی قبر کا نظریہ مردود قرار پائے گا۔ اگرچہ ان حضرات کے نزدیک اس کے مزعومہ فوائد کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

شاخوں والی حدیث کا نیا مطلب :

ان سات دلائل میں سے صرف ایک حدیث کا اشفاق صاحب نے جواب دیا ہے (اور وہ کرتے بھی کیا کہ اس پہلو سے عثمانی صاحب نے صرف ایک ہی حدیث کا جواب لٹریچر میں لکھا تھا) حدیث یہ تھی کہ:

رسول اللہ بمعہ صحابہ کرامؓ دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ جن میں دو میتوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ تو آپؐ نے درخت کی شاخ چیر کر آدھی ایک قبر پر اور دوسری آدھی دوسری قبر پر گاڑ دی۔ اور صحابہ کرامؓ کے پوچھنے پر آپؐ نے یہ وضاحت فرمائی کہ "جب تک یہ ٹہنیاں سوکھ نہ جائیں شاید ان کا عذاب کچھ ہلکا ہو جائے۔"

اس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے:

"اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی طرح آپؐ نے شاخیں لگا کر سمجھا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ شاخیں دُنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مُردے دفن کئے گئے تھے ان پہ یہ حالات گزر رہے ہیں اور یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ کیا تھا؟ نبیؐ کو بذریعہ وحی ایک بات کی اطلاع ملی تو آپؐ نے یہ اطلاع صحابہ کرامؓ کو بھی دے دی۔ اس میں معجزہ کی کیا بات ہے؟ انبیاءؑ کی بعثت کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہر ایسی بات، جس کا انہیں بذریعہ وحی علم ہوتا ہے، وہ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح خچر بدکنے کی اصل وجہ بتلانا۔ یا دھماکہ کی وجہ بتلانا جو انہیں بذریعہ وحی معلوم ہوتی ہیں، انہیں امت کو

بتلانا ہی انبیائؑ کا کام ہوتا ہے۔ اس میں معجزہ کی جو بات ہے کم از کم ہم تو نہیں سمجھ سکے معجزہ تو جب ہوتا اگر صحابہ کرامؓ بھی اس عذاب کو ہوتے دیکھتے یا سُن لیتے۔ معجزہ ہمیشہ وُہ ہوتا ہے جو نبی دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور دوسرے لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ نبی کے بذریعہ وحی علم کو معجزہ کہنا کیسے درست سمجھا جا سکتا ہے ؟

اور یہ تختہ سیاہ والی بات بھی خوب رہی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو بھی پوری نہیں تو کم از کم آدھی قبر آپ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ برزخی قبر کا تعلق سننے سنانے سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھنے دکھانے اور لکھ کر بتانے کا تعلق ہے تو یہ کام اس زمینی گڑھے والے تختہ سیاہ ہی سے لیا جائے گا۔ پھر اگر بفرضِ تسلیم اس نظریہ برزخی قبر کو مان بھی لیں تو بھی اس سے اتنا تو بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اس برزخی قبر سے اس زمینی گڑھے کا کچھ نہ کچھ تعلق ہے ضرور۔ جہاں جاکر عذابِ قبر سے متعلق باتیں سکھائی جاتی ہیں ———— اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں !

برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط :-

اس نظریہ کا استنباط یوں کیا گیا ہے کہ قرآن میں ہے " ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ" یعنی ہر شخص کو مرنے کے بعد قبر ملتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ قبر میسر نہیں آتی۔ کچھ لوگ ڈوب جاتے ہیں انہیں مچھلیاں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ بعض دوسروں کو جلا کر راکھ بنا دیا جاتا ہے۔ تو انہیں قبر کہاں ملی ؟ جبکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کو قبر ملتی ہے۔ لہٰذا "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے تحت برزخی قبر کا نظریہ قائم کیا گیا۔ برزخ کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں ایک دو بار آیا ہے اور قبر کا لفظ تو بہت مقامات پر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے ملانے سے برزخی قبر کی اصطلاح بن گئی۔ اب اگر یہ نظریہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہوتا تو کم از کم الفاظ تو قرآنی ضرور ہیں۔

اور اس نظریہ کو اپنانے کی وجہ یہ بنی کہ یہ حضرات اس سنّتِ الٰہی کہ "مرنے کے بعد اسے قبر دی" میں کسی استثنائ کے قائل نہیں۔ حالانکہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کوئی سنّتِ الٰہی ایسی نہیں جس میں استثنائ نہ ہو۔ قرآن میں صرف ایک سنّتِ الٰہی

کے متعلق چار مقامات پر آیا ہے کہ "فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلًا .... وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیلًا" اور وہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو قوم بداعمالیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کا عذاب ضرور آتا ہے۔ لیکن اس موثق سنت میں بھی اللہ تعالیٰ نے "اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ" فرما کر استثناء کی صورت پیدا کر دی ہے۔

اب دیکھیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو قبر ملتی ہے اور اس سے بھی زیادہ موثق سنتِ الٰہی یہ ہے کہ موت بھی صرف دو بار ہے۔ اور زندگی بھی دو بار۔ تو پھر جب اس موثق سنتِ الٰہی میں استثناء کی صورتیں قرآن سے ثابت ہیں۔ جیسے کہ میں اپنے مقالہ میں وضاحت سے پیش کر چکا ہوں۔ تو اس "مرنے کے بعد قبر ملنے کے" قانون میں استثنائی صورتوں کو تسلیم کرنے میں آخر کیا چیز مانع ہے؟ اور یہ استثنائی صورتیں یہ ہیں کہ کچھ لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں، بعض کو درندے پھاڑ کھاتے ہیں، کچھ دوسروں کو جلا دیا جاتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود عام اصول یہی ہے کہ مرنے والے کو اللہ تعالیٰ قبر دیتا ہے اور ابتدا سے آدمؑ سے انبیاء کی یہی تعلیم رہی ہے کہ مُردوں کو قبر میں دفن کیا جائے۔ اور یہی چیز احترامِ انسانیت ہے۔ پھر اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ہر مرنے والے کو مرنے کے ساتھ ہی عذاب و ثواب قبر شروع ہو جاتا ہے اور عذاب و ثواب کے لیے روح کے ساتھ جسم ہونا لازمی ہے۔ پھر جن لوگوں کا جسم ہی باقی نہ رہا ہو انہیں عذاب و ثواب کیونکر ہو گا؟ پھر قرآن میں فرعون کے ذکر میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے جسم کو نجات دی جائے گی اور یہ بھی ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون سب کو مرنے کے بعد عذاب پر پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تطبیق کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مرنے کے بعد روح کو ایک نیا برزخی جسم ملتا ہے۔ اور یہی جسم اس کی برزخی قبر ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں روح کو کسی نئے جسم کی ضرورت نہیں۔ روح کا اپنا بھی ایک جسم ہے۔ جس کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات :

قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے پر عثمانی صاحب اور اسی طرح موجودہ دَور کے بعض دیگر لوگوں کو مندرجہ ذیل قسم کے اعتراضات ہیں۔

۱۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہوتا ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک ہی قبر میں کئی مُردے دفن ہوتے ہیں۔ اب بتلائیے کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے یا ثواب ؟

۲۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب منکر نکیر آتے ہیں تو مُردے کو قبر میں بٹھلا دیا جاتا ہے۔ پھر مومن کے لیے یہ قبر کشادہ کی جاتی ہے حالانکہ اس زمینی گڑھے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سے برزخی قبر ہی مراد لی جائے۔

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ستر ایسے زہریلے سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کو ڈس لے تو زمین سبزہ اُگانا چھوڑ دے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ زمین نے آج تک سبزہ اُگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہٰذا قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینا درست نہیں۔

۴۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قبریں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری دُعا سے وُہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایک قبر میں نیک و بد دونوں قسم کے مُردے ہوں تو کیا صورت ہوگی ؟ کیا ان سب کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا ؟

۵۔ زانیوں کی قبریں دنیا میں مختلف مقامات پر ہوتی ہیں لیکن رسول اللہؐ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں ایک ہی جگہ ایک تنور میں عذاب ہو رہا تھا وغیرہ۔

اعتراضات کے جوابات

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب دراصل میں اپنے مقالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے اپنے مخصوص قسم کے نکات پر ہی نظر ڈالی۔ لہٰذا اب اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک کمرے میں دو آدمی سو رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو خواب کی حالت میں پٹ رہا ہے لیکن دُوسرا خواب ہی میں دعوتیں اڑا رہا ہے اور ایک تیسرا

آدمی ان دونوں کے پاس بیٹھا جاگ رہا ہے۔ اب دیکھیے یہ تینوں آدمی ایک دوسرے اور تیسرے کے حالات سے قطعًا بے خبر ہیں کیونکہ تینوں کے عالم الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ہمارے محسوسات کے لحاظ سے تینوں ایک کمرے میں، ایک مقام پر اور ایک عالم یہ دُنیا میں ہیں۔

عالم برزخ کا تھوڑا بہت تصور، جتنا کہ اس عالم دنیا میں ممکن ہے، خواب اور اس کے کوائف و واردات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ نیند بھی زندگی اور موت کے درمیان برزخ ہے اور اسی لیے نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند میں چونکہ زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اس دَور کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور برزخ میں چونکہ موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار پائے جاتے ہیں اسی لیے اس موت کے دَور کو برزخی زندگی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

اس تصریح سے عثمانی صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیا رُوحیں دو ہیں؟ ایک تو عذاب و ثواب بھگت رہی ہے اور دوسری دنیا میں اپنے قبر میں پڑے ہوئے جسم میں موجود ہوتی ہے تو کیا رُوحیں دو ہوتی ہیں؟ اگر اس دنیا میں اس طرح کی دو رُوحوں کے وجود کا امکان ہے تو اس دُنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ ایک رُوح سوئے ہوئے انکے جسم میں ہوتی اور دوسری آسمانوں کی سیر کرتی پھرتی ہے۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں "حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ایسے زہریلے ستر سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں ایک سانپ زمین کو ڈس لے تو وُہ سبزہ اگانا چھوڑ دے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین نے سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہٰذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔"

یہ بھی عجیب قسم کی منطق ہے، کہ سانپ ڈسے تو انسان کو اور سبزہ اُگانا زمین چھوڑ دے، وُہ کیوں؟ آخر اس سانپ نے زمین کو تو ڈسا نہیں، پھر جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ عذاب و ثواب قبر کا بیشتر انحصار رُوح یا رُوح کے جسم پر ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شدت سے کبھی کبھار قبر میں پڑا ہوا جسدِ عنصری بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ تو بدکردار انسان کے اس عذاب سے آخر زمین سبزہ اُگانا کیوں چھوڑ دے؟

یہ اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات میں عام غلطی جو ہوتی ہے وُہ یہ ہے کہ بات تو کرتے ہیں رُوح اور عالم برزخ کی، اور اسے پرکھنا چاہتے ہیں انسانی عقل اور محسوسات

سے، حالانکہ یہ بات اصولاً غلط ہے۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ رُوح کے متعلق انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ تو پھر اس تھوڑے سے علم کی بنیاد پر ایک نظریہ قائم کرنا پھر اس نظریہ کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اس میں اتنا متشدد اور متعصب ہو جانا کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف بات کرے اسے کافر و مشرک کے القاب دے ڈالنا، آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے؟

شہداء اور عالمِ برزخ:

شہداء کے متعلق قرآنِ کریم میں ایک جگہ تو یہ مذکور ہے کہ "انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وُہ زندہ ہیں" (البقرۃ ۱۵۴) اور دُوسری جگہ فرمایا کہ "اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مُردہ گمان بھی نہ کرو۔ بلکہ وُہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں" اور احادیث سے ثابت ہے کہ شہداء کو سبز رنگ کے پرندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ وُہ جنت کے باغوں میں لہلہاتے، جنت کے میوے کھاتے اور عرشِ الٰہی کے نیچے لٹکتی ہوئی سنہری قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۳۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخی زندگی تو سب ہی کو ملتی ہے خواہ وُہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہر کوئی عذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوتا ہے تو پھر شہداء کی خصوصیت کیا رہی؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ انہیں مُردہ نہ کہو یا نہ سمجھو محض ازراہِ اعزاز ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات محض ازراہِ عزت و احترام نہیں۔ بلکہ وُہ فی الحقیقت زندگی کے دَور میں ہیں جیسا کہ قرآن میں دونوں مقامات پر "بَلْ أَحْيَاءٌ" کے الفاظ آئے ہیں جبکہ باقی سب انسانوں کے لیے "أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اور شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان پر سے مرحلہ ۳ یعنی مرنے کے بعد سے لے کر یوم البعث تک کا دَور۔ جسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں اور قرآن اسے موت کا دَور بتلاتا ہے، یکسر اٹھا لیا جاتا ہے اور وُہ مرحلہ ۲ یعنی دنیوی زندگی میں شہادت پاتے ہی فوراً سیدھے مرحلہ ۴ یعنی مکمل اور دائمی زندگی کے دَور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان سے منکر نکیر کے سوال و جواب نہیں ہوتے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ "بَلْ أَحْيَاءٌ" کا یہی مطلب ہے جبکہ عثمانی صاحب شہداء کی برزخی زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ وُہ فرماتے ہیں؛

"اس طرح سے صاف بتلا دیا گیا کہ شہداء اپنے رب کے پاس ہیں اور وہاں رزق پا رہے ہیں۔ ان قبروں کے اندر زندہ نہیں۔ ان کی زندگی برزخی ہے دنیاوی نہیں۔" (یہ قبریں یہ آستانے ص ۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور عام انسانوں کی بھی، تو عام انسانوں کے لیے "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ" اور شہداء کو "بَلْ اَحْيَاءٌ" کیوں کہا گیا؟

موت کے بعد شہداء اور عام انسانوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں سبز پرندوں کا جسم عطا ہوتا ہے اور یہ جسم حقیقی اور مستقل ہوتا ہے جبکہ دوسروں کی روح کو ان کا اپنا ہی جسم یا بقول عثمانی صاحب نیا جسم عطا ہوتا ہے جو ہر آن بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

۲۔ اعادۂ روح اور عذاب قبر

اعادۂ روح کے متعلق جتنی بھی احادیث آتی ہیں، عثمانی صاحب نے ان کو یا تو مجروح و موضوع قرار دیا ہے یا پھر ان کی کوئی نئی اور مضحکہ خیز تاویل پیش کر دی ہے۔ اثبات اعادۂ روح کے موضوع پر ایک الگ پمفلٹ شائع ہو چکا ہے جس میں عثمانی صاحب کی ان "علمی تحقیقات" کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا۔ سردست ہم صرف بخاری کی اسی حدیث سے تعرض کریں گے جو موضوع زیر بحث میں اکثر پیش کی جاتی ہے۔ پھر اس سے ممکنہ نتائج پر غور کریں گے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ:

"اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ اِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ اَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِّنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا۔ قَالَ قَتَادَةُ وَذُكِرَ لَنَا اَنَّهٗ يُفْسَحُ لَهٗ فِيْ قَبْرِهٖ ثُمَّ

رَجَعَ اِلٰی حَدِیْثِ اَنَسٍ قَالَ: وَاَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْکَافِرُ فَیُقَالُ لَہٗ مَا کُنْتَ تَقُوْلُ فِیْ ھٰذَا الرَّجُلِ فَیَقُوْلُ: لَا اَدْرِیْ، کُنْتُ اَقُوْلُ مَا یَقُوْلُ النَّاسُ فَیُقَالُ لَا دَرَیْتَ وَلَا تَلَیْتَ فَیُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِیْدٍ ضَرْبَۃً فَیَصِیْحُ صَیْحَۃً یَسْمَعُہَا مَنْ یَلِیْہِ غَیْرُ الثَّقَلَیْنِ۔" (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب آدمی اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس لوٹتے ہیں تو بلا شبہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے (اسی وقت) اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: "تو اس شخص یعنی محمدؐ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟" اب اگر وہ ایماندار ہے تو کہتا ہے، کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" پھر اس سے کہا جاتا ہے۔" تو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدل تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا۔" تو وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ قتادہ کہتے ہیں" اور ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔" پھر انس کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا "اور اگر وہ منافق یا کافر ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے"؟ تو وہ کہتا ہے۔ "میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔" پھر اس سے کہا جائے گا کہ "نہ تو تو خود سمجھا اور نہ ہی خود پڑھا۔" اور لوہے کے ہنٹروں سے اسے ایسی مار پڑے گی کہ وہ بلبلا اٹھے گا۔ اور اس کی یہ چیخ جن و انسان کے سوا تمام آس پاس کی چیزیں سنتی ہیں۔"

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ بنیادی طور پر "وَضَعَ" کا لغوی معنی اُتارنا اور نیچے رکھنا ہے۔ (مفردات امام راغب) اور "وُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ" کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قبر سے مراد یہی زمینی

گڑھا ہے۔ رُوح کو کسی برزخی جسم میں داخل کرنے کے لیے " وُضِعَ " کا لفظ استعمال نہیں ہو گا۔

۲۔ " وَتَوَلّٰی عَنْهُ اَصْحَابُهٗ " کے الفاظ سے بھی قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے کیونکہ میت کے ساتھی اسی زمینی قبر سے واپس جاتے ہیں نہ کہ برزخی قبر سے۔

۳۔ جن وانس کے سوا تمام اشیاء میت کے عذاب، آہ و بکا کو سنتی ہیں۔ جنوں کے متعلق ہم وثوق سے کہہ نہیں سکتے۔ لیکن انسان تو اسی زمین پر بستے ہیں اور " مَنْ يَلِيْهِ " کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ اس قبر کے آس پاس کی اشیاء اور جن وانس ہیں۔ اب انسان چونکہ اسی زمین کے پاس ہو سکتے ہیں۔ برزخی قبر کے پاس نہیں ہوتے۔ لہٰذا قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

۴۔ " اِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ " (یعنی مُردہ ان واپس جانے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے) کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس جسم میں رُوح بھی ہوتی ہے۔ جو موت کے وقت فرشتے نکال کر لے گئے تھے۔ اس سے اعادۂ رُوح کا اثبات ہوتا ہے۔ اب یہ سوال کہ رُوح فرشتے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یا یہ رُوح ان کی آمد سے پہلے لوٹائی جاتی ہے۔ اور پھر یہ روح واپس کب اور کس طرح جاتی ہے؟ ایسے سوال ہیں جن کے جاننے کے ہم مکلف نہیں ہیں۔ اور یہ سوال ایسے ہی ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ عیسیٰ جن مُردوں کو زندہ کرتے تھے، وُہ دوبارہ کب مرتے تھے؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ رُوح کا اصل ٹھکانا یہ دنیاوی قبر نہیں ہے اور رُوح کی یہ واپسی ایک اضطراری امر اور اللہ کے حکم کے تحت ہے۔

۵۔ " فَيُقْعِدَانِهٖ " یعنی وُہ دونوں فرشتے قبر میں لیٹی ہوئی میت کو اُٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ فرشتوں کے اس عمل سے بھی قبر کے زمینی گڑھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ برزخی قبر تو محض رُوح کو ایک نیا جسم ملنے کا نام ہے اور یہی نیا جسم اس کی برزخی قبر ہے۔ اس برزخی قبر میں فرشتوں کے میت کو اُٹھا کر بٹھلانے کا تصور ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ " قبر میں فرشتے لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ نیز مومن کے لیے قبر کھول دی جاتی ہے " اس سے عثمانی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ قبر کو اسی

وقت اکھاڑنے سے ہم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں دیکھتے۔ لہٰذا قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں ہو سکتا اور اس سے مراد بس برزخی قبر ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ ہم اس سے بالکل دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قبر کی اندرونی دنیا، اس کی خارجی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قبر میں رکھی ہوئی میّت سے جو واردات و حوادث پلش آرہے ہوتے ہیں۔ اس سے قبر کو اکھاڑنے والا شخص کبھی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں نہایت سنسنی خیز حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بیٹھنے اور جاگنے والے کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ دونوں اسی دنیا میں اور ایک ہی جگہ پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا برزخی قبر کے نظریہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہ بات میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اس دنیا میں خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہونے والی روح کا اپنے مادی جسم سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن قبر یا عالم برزخ میں اس رنج و راحت سے دوچار ہونے والی روح کا اپنے جسم سے تعلق نہایت کمزور اور کبھی کبھار ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق بھی روح کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس دور کو "اَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ روایت درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ قبر میں اعادۂ روح کے قائل ہیں۔ پھر انہوں نے یہ روایت ایک ممتاز صحابی حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالک بھی اعادۂ روح کے قائل تھے۔ پھر درمیان میں جتنے حضرات سے اس کا سلسلۂ سند منسلک ہے، یہ سب حضرات بھی اعادۂ روح کے قائل تھے۔ پھر آخر امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ، ابن حجرؒ اور ایک جم غفیر" نے کونسا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ انہیں بدعقیدہ، گمراہ، کافر و مشرک اور ایمان سے خالی وغیرہ وغیرہ القابات سے نوازتے ہیں؟

اب آپ کے ممدوحین میں سے ایک امام ابو حنیفہؒ رہ جاتے ہیں جن کے سوال و جواب کو غلط جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ جہاں تک روح کے قبر میں واپس آنے اور پھر ہر وقت موجود رہنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اصل سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ کیا کسی وقت اعادۂ روح ممکن بھی ہے یا نہیں، خواہ یہ محض استثنائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں کسی صحابیؓ، امام بخاریؒ یا امام ابو حنیفہؒ کا قول پیش فرمائیے۔ تو قطع نزاع کے لیے دلیل کا کام دے سکتا ہے سامام ابو حنیفہؒ کے واقعہ سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح قبر میں موجود نہیں ہوتی۔ بلکہ اہلِ قبور "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ" ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کسی صحابیؓ، امام بخاریؒ یا امام ابو حنیفہؒ، بلکہ ان کے علاوہ علمائے متقدمین[1] میں سے کسی ایک کا نام بتلا سکتے ہیں جس نے قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے کی بجائے آپ کی مزعومہ برزخی قبر لیا ہو؟

ہم نے یہاں بخاری سے صرف ایک حدیث عذابِ قبر سے متعلق درج کی ہے جبکہ دوسری کتبِ صحاح میں بھی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ پھر ایسی صحیح روایات کے علی الرغم ہم اس استثنائی صورت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اسی زمینی قبر میں فرشتے آتے ہیں تو میّت کی رُوح واپس قبر میں لوٹائی جاتی ہے ساسی زمینی گڑھے میں فرشتے سوال و جواب کرتے ہیں اور یہیں سے میّت کو عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ ہم میّت کے جسم سے اس کی رُوح کے اس استثنائی، کمزور اور غیر مستقل تعلق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا میں خواب کی صورت میں اس سے ملتی جلتی باتیں مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں۔ اور یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا ہے ہی نہیں؛ اسی طرح اس زمینی گڑھے میں ہونے والے سوال و جواب اور عذاب و ثواب سے قطعی انکار ہمارے لیے ناممکن ہے۔

"تَنْزِعُ نِعَالِهِمْ" کی عثمانی تشریح:

"تَنْزِعُ نِعَالِهِمْ" کی شرح میں آپ کو بخاری کے کسی شارح الزین بن المنیر کی شرح بہت پسند آئی ہے اور اس شرح کا اشفاق صاحب نے بھی اپنے خط میں ذکر

---

[1] گو ہم سماعِ موتیٰ کے مسئلہ میں ان سب حضرات سے کلّی طور پر متفق نہیں۔ تاہم ہم ان کے لیے ایسے غلط قسم کے القابات کسی صورت پسند نہیں کرتے۔

فرمایا ہے۔ اور وہ شرح یہ ہے کہ "نِعَالِهِمْ" میں "هُمْ" کی ضمیر بعد میں آنے والے الفاظ "اَتَاهُ مَلَكَانِ" کی طرف پھرتی ہے۔ اب اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی وارد ہوتے تھے۔ جن کے جواب بھی عثمانی صاحب نے دیے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اعتراضات اور ان کے جوابات چونکہ علمی انداز کے ہیں، اس لیے ہم ان کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

اعتراض ۱: هُمْ۔ جمع کی ضمیر ہے۔ اگر اس سے مراد فرشتے ہوتے تو تثنیہ کی ضمیر "هُمَا" آنا چاہیئے تھی۔

اس کا جواب عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ "عربی زبان میں دونوں طریقے رائج ہیں۔ تثنیہ کے لیے جمع کا استعمال عام ہے جیسے قرآن کی آیت ہے:

"قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ۔" (شعراء ۱۵)

"فرمایا، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر۔ ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔"

"فَاذْهَبَا" میں تثنیہ کی ضمیر ہے اور "مَعَكُمْ" میں جمع کی۔

اسی طرح بخاری کی حدیث خضر میں یہ الفاظ ہیں:

"فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِيْنَةٌ فَكَلَّمُوْهُمْ اَنْ يَّحْمِلُوْهُمَا"

"پس گزری ان دونوں (موسیٰ و خضر) کے پاس سے ایک کشتی، پس انہوں نے (جمع کا صیغہ) کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان دونوں کو کشتی میں سوار کرلیں" (بخاری عربی جلد ۱ ص ۲۳، سطر ۱۵، ۱۶)

"فَكَلَّمُوْهُمْ" کے ساتھ ساتھ "فَكَلَّمَاهُمْ" بھی بخاری کی روایت میں ہے مگر حاشیہ پر اور نسخہ کے طور پر۔ متن میں "كَلَّمُوْهُمْ" کو ہی ترجیح دی گئی ہے جو تثنیہ کے بجائے جمع کا صیغہ ہے۔"

جواب:

عربی زبان میں تثنیہ کے لیے جمع کا صیغہ عام نہیں۔ اگر عام ہوتا تو گرامر کی کتابوں میں اس کا ضرور ذکر پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تثنیہ کی صورت میں جمع کا استعمال شاذ ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے مثلاً:

پہلی مثال میں "كُمْ" کی ضمیر "مَعَ" کی وجہ سے آئی ہے۔ گویا فرعون کی طرف

جانے والے تو صرف دو تھے مگر سننے والوں میں اللہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور ضمیر جمع میں بدل گئی۔ دوسری مثال میں ایک مقام پر "کَلَّمُوْھُمْ" اس لیے آیا ہے کہ موسیٰؑ کے ساتھ ان کا ایک ساتھی (یوشع بن نون) بھی تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن قابلِ ذکر چونکہ دو ہی ہستیاں تھیں یعنی موسیٰؑ و خضرؑ اس لیے اکثر تثنیہ کا ضمیر آیا اور ایک جگہ اشتباہ کی وجہ سے جمع کا ضمیر بھی آیا۔ اگرچہ اس کی حاشیہ میں تصحیح کر دی گئی۔

اعتراض ۲:

"ھُمْ" کی ضمیر اگر "مَلَکَانِ" سے متعلق ہے تو یہ پہلے کیسے آ گئی؟ اس کا جواب عثمانی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:

"عربی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بات بالکل صاف ہو اور سننے والے سے غلطی کرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پہلے اسم کا ذکر نہیں کیا جاتا جیسے قرآن میں ہے:

"اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا" (الواقعہ ۳۵، ۳۶)

"ہم نے ان کو (ان کی بیویوں کو) ایک خاص اٹھان سے اٹھایا ہے اور ہم اُن کو رکھیں گے کنواریاں"

یا سورۂ یٰسین میں:

"وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ" (یٰسین ۶۹)

"اور ہم نے اس (پیغمبرؐ) کو شعر کی تعلیم نہیں دی"

جواب ۱: پہلی مثال اس لحاظ سے غلط ہے کہ "اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ" سے چند آیات پہلے "حُوْرٌ عِیْنٌ کَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَکْنُوْنِ" کا ذکر آ چکا ہے۔ بعد میں جنت کی چند صفات بیان کر کے "اَنْشَاْنٰھُنَّ" کی ضمیر "حُوْرٌ عِیْنٌ" کی طرف پھیری گئی ہے جو درست ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اسے خواہ مخواہ "اَبْکَارًا" کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ لفظ بعد میں آیا ہے۔

جواب ۲: مثال تو ایسی درکار تھی کہ ضمیر پہلے آئے اور اس کا مرجع اسم بعد میں ہو۔ پہلی مثال میں آپ نے بعد میں مرجع "اَبْکَارًا" جو بتلایا ہے، وہ ویسے ہی غلط ہے اور دوسری مثال میں ضمیر کا مرجع اسم مذکور ہی نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کا جواب

درست کیسے سمجھا جائے؟

اب دیکھیے کہ "قَرْعَ نِعَالِهِمْ" کا مرجع "اَصْحَابُهٗ" واضح طور پر جب موجود ہے تو "هُمْ" کا مرجع آخر "مَلَكَانِ" کیوں قرار دیا جاتے؟ لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کو "الزین بن المنیر" کی تشریح اس لیے پسند آگئی کہ یہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتی تھی۔

سماعِ موتیٰ کے متعلق قولِ فیصل:

قرآن کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ مُردے سن نہیں سکتے اور ہم خود بھی اسی بات کے قائل ہیں! —— پھر قرآن ہی کی رُو سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس قانونِ الٰہی میں بھی استثناء موجود ہے اور وُہ استثنا یہ ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ" یعنی "اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سُنا سکتا ہے۔" اب اگر سماعِ موتیٰ کا یکسر انکار کر دیا جائے تو "اسماعِ موتیٰ" کا از خود انکار ہو گیا۔ گویا یہ مسئلہ صرف "سماعِ موتیٰ" کا نہیں بلکہ "اسماعِ موتیٰ" کا بھی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو سُنا تو سکتا ہے مگر سُنایا کبھی نہیں، تو یہ بات بھی یکسر غلط ہے۔ قلیبِ بدر کے مقتولین کو اللہ تعالیٰ نے سُنا دیا تھا، علیٰ اللہ کے اذن سے مُردوں کو "قُمْ" کہتے تھے تو وُہ مردے یہ حکم سُن کر ہی جی اٹھتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گو ایسے واقعات کا انداز معجزانہ ہی سہی لیکن ان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ پھر چونکہ "اسماعِ موتیٰ" اور "سماعِ موتیٰ" دونوں لازم و ملزوم ہیں لہٰذا "سماعِ موتیٰ" بھی استثنائی صورتوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے۔

نظریہ "برزخی قبر" کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت:

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات "حیات فی القبر" کے ہم معنی اور قبر پرستی کے شرک کی اصل اور بنیاد ہے۔" (عذابِ قبر ص ۲۶)

اب دیکھیے جہاں تک شرک کی اصل بنیاد کے استیصال کا تعلق ہے، ہم بدل و جان عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وُہ شرک کی اصل بنیاد اس دُنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات اور حیات فی القبر قرار دیتے ہیں جبکہ ہم شرک کی اصل بنیاد سماعِ موتیٰ کا علی الاطلاق وقوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجوہ

درج ذیل ہیں؛

۱۔ قبر میں زندگی اضطراری امور سے تعلق رکھتی ہے۔ دائمی اور مستقل ہرگز نہیں ہوتی۔ میت یا اس کی روح کا اس میں کچھ اختیار یا عمل دخل نہیں ہوتا۔

۲۔ پھر یہ نامکمل سی زندگی بھی ایسی ہے جس کا صحیح فہم ہمارے عقل و حواس سے ماوراء ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور ہے اور یہ عالم اور۔ لہٰذا ان کی یہ زندگی بے کار ہے۔ نہ ہم انہیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں۔ نہ وہ ہماری بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں یا جواب دے سکتے ہیں۔ تو پھر ان کی زندگی کا ہمیں کیا فائدہ یا نقصان ہے؟ ان کی اس زندگی میں اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتے ہی انہیں کچھ سنا، یا وہ ان سے کچھ سن سکتے ہیں یا سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ جو شرک کی بنیاد بنتا ہے وہ سماع موتیٰ کا ہے نہ کہ دنیوی قبر میں عذاب اور حیات فی القبر! ——— لہٰذا ہماری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی جملہ مساعی سماع موتیٰ کی تردید میں صرف کیجئے۔ ان شاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔



سماعِ موتیٰ سے تصرفاتِ اولیاء تک

مراسلات (۳)

بسلسلہ روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتیٰ

(یہ جوابات محدث کی تین اقساط جمادی الآخر، رجب اور شعبان و رمضان ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)

سماعِ موتیٰ سے یکسر انکار کرنے والوں کے بعد اب سماعِ موتیٰ کے قائلین کی طرف سے اعتراضات کی باری آئی۔ اس سلسلہ میں چوہدری محمد علی صاحب حنفی (پکا ڈیرہ وڑائچاں کوٹ رنجیت ضلع شیخوپورہ) کی طرف سے ادارہ محدث کے نام ایک طویل ترین خط موصول ہوا۔ جو خط سے زیادہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی آخر میں یہ آرزو بھی کی گئی ہے کہ:

"آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ "محدث" جو کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے، تصویر کا دوسرا رُخ بھی شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ تاکہ "محدث" کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں"

یہ خط یا مضمون فل سکیپ کے مکمل دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، تحریر گنجان ہے جو محدث کے کم و بیش ۲۵ صفحات کا متقاضی ہے۔ پھر اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ صفحات جواب کے لیے بھی درکار تھے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ایک ماہوار رسالہ ایک قسط میں تو یہ سب کچھ شائع نہ کرسکتا تھا۔ اور اگر ایک قسط میں صرف یہ خط یا مضمون شائع کیا جاتا اور اگلے پرچے میں جوابات دیے جاتے، تو قارئین کو تقابل میں دقت محسوس ہوتی۔ اور اگر خط کا محض خلاصہ میں اپنی طرف سے

پیش کر کے اس کے جوابات قلمبند کر دیتا۔ تو مضمون نگار کی طرف سے اعتراضات کی گنجائش باقی رہتی۔ لہٰذا مضمون نگار کی آرزو کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس مکمل خط یا مضمون کو بایں صورت شائع کیا جائے کہ پہلے اس کا ایک حصہ من وعن نقل کر دیا جائے، پھر اس کا جوابؒ لکھ دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر یہ مکمل مضمون بمعہ جوابات دو یا تین اقساط میں بھی شائع ہو، تو قارئین وارد شدہ اعتراضات کے ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔

جواب لکھنے میں میں نے حتی الوسع اختصار سے کام لیا ہے اور صرف ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے جن کا جواب دینا ضروری تھا اور جن پر حواشی کے نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ پھر اسی ترتیب سے ان کا جواب بھی لکھا گیا ہے ——— جبکہ اصل مضمون کا من وعن شائع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ صاحبِ مضمون کو یہ حسرت نہ رہ جائے کہ ان کا مضمون قطع وبرید کے ساتھ یا توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے۔

(عبدالرحمٰن کیلانی)

سماعِ موتیٰ۔ تصویر کا دوسرا رخ

مکرمی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "محدث" لاہور

سلام مسنون! چند ماہ سے آپ کے رسالہ "محدث" کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں اور محدث میں چھپنے والے معیاری علمی مضامین سے کافی متاثر ہوں۔

اس وقت میرے سامنے آپ کے ماہنامہ "محدث" بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء، ماہ جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارے ہیں۔ جن میں جناب مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کا مضمون "روح، عذابِ قبر، سماعِ موتیٰ" قسط وار شائع ہوا ہے۔ جس میں کیلانی صاحب نے قائلینِ سماع کے دلائل سے مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ اسی سلوک نے مجھے آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ بخشا ہے تاکہ کیلانی صاحب کو ان حقائق سے روشناس کرایا جائے، جنہیں مولانا موصوف نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔

ع اس کتاب میں ترتیب بدل دی گئی ہے اور بعض لفظ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے

مولانا گیلانی صاحب نے قرآنِ مجید کی چند آیات اور چند احادیث کے حوالے سے جو رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:
سماعِ موتیٰ ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا چور دروازہ ہے (گویا قائلینِ سماع مشرک ہیں[۱])
غائب شدہ بزرگوں کو پکارنا ان کی عبادت کے مترادف ہے۔ غیب یا فوت شدہ بزرگ کسی کی پکار کر جواب دینا تو درکنار ان کی بات بھی نہیں سن سکتے۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ زندہ نہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں اور انہیں اپنی ذات سے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؛
اس مسئلہ میں قرنِ اول میں اختلاف موجود تھا۔ حضرت قتادہ اور حضرت امّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سماعِ موتیٰ کے منکر تھے۔ قلیب بدر والی حدیث حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک صحیح نہیں[۲]۔ جن احادیث سے سماعِ موتیٰ ثابت ہوتا ہے

---

[۱] کیا سماعِ موتیٰ کے قائل مشرک ہیں؟
میں نے سماعِ موتیٰ کے قائلین کو کسی جگہ بھی مشرک نہیں کہا۔ یہ مولانا محمد علی صاحب کا اپنا خیال ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتیٰ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مستفسر شاہ فاروق ہاشمی صاحب نے پوچھا تھا کہ "سماعِ موتیٰ کے قائلین کے حق میں آپ کیا فتوائے دیتے ہیں؟" تو میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ "میں کوئی فتویٰ دینے کے حق میں نہیں ہوں، البتہ آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اس سلسلہ میں متشدد نہ ہوں۔" (محدث رمضان ۱۴۰۴ھ ص ۲۱/۲۲)
—— رہی یہ بات کہ یہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ کیسے ہے؟ تو اگر تو بات صرف سماعِ موتیٰ تک محدود رہتی تو اس میں حرج بھی نہ تھا۔ مگر جب بات یوں بڑھے کہ مردے علی الاطلاق سنتے ہیں اور ہر آنے والے کی ہر وقت سنتے ہیں۔ پھر صرف سنتے ہی نہیں، جواب بھی دیتے ہیں۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں۔ پھر صرف قبر پر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ سے سن سکتے ہیں۔ تو بتلائیے کہ اور شرک کسے کہتے ہیں؟ ندا لغیر اللہ اور کیا چیز ہے؟ جس کی قرآن پُر زور تردید کرتا ہے جبکہ یہ بھی مسلّم ہے کہ اللہ کے سوا جتنے بھی معبود ہیں سب باطل ہیں۔
[۲] یہ بحث ذرا تفصیل سے آگے چل کر آئے گی۔

وُہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابلِ احتجاج نہیں ہوتیں۔ جوتوں کی چاپ سننے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میّت کو احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز واقارب کی وجہ سے تُو مارا مارا پھرتا تھا وُہ تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں، اس کے علاوہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔

یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ میری رُوح کو لوٹاتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سلام کا جواب دیتا ہوں جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے الخ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں جیسا کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے؛ اگر زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹائے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

قرآن مجید سماعِ موتیٰ کی پرزور تردید کرتا ہے۔ ضعیف، وضعی احادیث سماعِ موتیٰ کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ اماموں اور بزرگوں کی روایات سب خرافات ہیں۔ انہیں ماننا گویا قرآن وسنت سے دستبردار ہونا ہے۔

مولانا کیلانی صاحب نے اکابر مفسّرین پر اعتماد کرنے کی بجائے من مانے نتائج اخذ کیے ہیں اور اگر اعتماد کیا ہے تو مولانا مودودی صاحب پر۔ گویا کیلانی صاحب نے جو تشریحات کی ہیں اور مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے قرآن وسنّت کا منشار بھی یہی ہے۔

مولانا مودودی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ "میں نے دین کو ماضی یا حال کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنّت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے کبھی یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے اور کرتے ہیں۔" (رودادِ اجتماع)

کیلانی صاحب نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ "اللہ کا شکر ہے کہ اہلحدیث نہ کسی امام کا مقلد ہے نہ علّامہ کا، وُہ ان بزرگوں سے استفادہ تو کرسکتا ہے مگر روشنی براہِ راست قرآن وسنّت سے حاصل کرتا ہے۔"

الزام یہ نہیں کہ مولانا مودودی صاحب قرآن وسنّت کو دین کا ماخذ کیوں سمجھتے تھے اور کیلانی صاحب کیوں سمجھتے ہیں؟ بلکہ اعتراض یہ ہے کہ ماضی کے اشخاص اور

بزرگوں میں صحابہ کرام سے تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین و محدثین سب آجاتے ہیں۔ بقول علامہ ارشد القادری، (مصنف "زلزلہ") (یہ وُہ لوگ ہیں کہ) جن کی مشترک اور متوارث کوششوں[۳] سے دین اپنی واضح اور مفصّل تشریحات کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن نہ مولانا مودودی صاحب کو ان بزرگوں کی فکر و دیانت پر اعتماد تھا اور نہ کیلانی صاحب کو ہے، یہ سب کی رائے ٹھکرا کر اپنی برتری منوانا چاہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنّت ہی دین کا اصل ماخذ ہے، لیکن بحث الفاظ و عبارات میں نہیں، ان کے مفہوم و معانی میں ہے[۴] اور ظاہر ہے کہ مفہوم کے تعین میں فہم

---

[۳] بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششیں؟

اب دیکھیے ان بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششوں سے ہی دین شیعہ حضرات کو بھی پہنچا ہے۔ بریلویوں، قادیانیوں، اہلحدیثوں کو بھی۔ غرضیکہ سب حضرات دین کی تفہیم کے بارے میں اپنے ڈانڈے انہی بزرگوں کے واسطہ سے تابعین اور صحابہؓ تک پہنچاتے ہیں، تو کیا یہ سارے کے سارے فرقے حق پر ہیں؟ آخر کون سی دلیل سے آپ اپنے علاوہ دوسروں کے بزرگوں کے فہم کو رد کر سکتے ہیں؟

[۴] میں اپنا فہم پہلے بھی بوضاحت پیش کر چکا ہوں۔ اور وُہ یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن سماعِ موتیٰ کی پُرزور تردید کرتا ہے۔

۲۔ پھر قرآن ہی سے اللہ تعالیٰ کے، مُردوں کو سنانے کی استثنائی صورت بھی ثابت ہوتی ہے جس کی تائید بعض احادیثِ صحیحہ بھی کرتی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث یا تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث سماعِ موتٰے کا علی الاطلاق جواز ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ بعض بزرگوں کے اقوال صرف سماعِ موتیٰ تو در کنار، ان مُردوں کے جواب دینے اور حاجت روائی اور مشکل کشائی یا تصرف فی الامور کی بھی پرزور تائید کرتے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے صریح خلاف ہیں۔

پھر مجھے قطعاً یہ اصرار نہیں کہ دوسرے لوگ میرے فہم کو قابلِ اعتماد سمجھیں بلکہ ان کے لیے بھی یہی راہِ صواب ہے کہ وُہ ہر بات کو کتاب و سنّت پر پیش کرنے کے بعد ہی کسی بات کو درست یا نا درست قرار دیں۔

ہی کو دخل ہے۔ اور جب اکابر امت کا فہم مولانا مودودی صاحب کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں تھا اور جناب کیلانی صاحب کے نزدیک نہیں ہے تو خود ان کے فہم پر کوئی کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟

قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی آئی ہے،

"اس امت کے پچھلے اگلوں پر لعن طعن کریں گے۔" (ترمذی جلد دوم)

۵۔ پچھلوں کا پہلوں پر لعن طعن۔

لعن طعن کرنا اور بات ہے۔ ان کی عزت و تعظیم کرنا اور بات، اور ان کے اقوال و ارشادات کو قابلِ اتباع اور حجت سمجھنا اور بات ہے۔ لعن طعن کرنے والے تو شیعہ حضرات ہیں جو علی الاعلان صحابہ کرامؓ پر تبرا بولتے ہیں۔ یا پھر خارجی، ناصبی، رافضی وغیرہ ہیں۔ جو علی الاعلان لعن طعن نہ بھی کریں، تاہم ان کے منہ سے ان بزرگوں کے حق میں کلمۂ خیر کم ہی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی بزرگوں پر لعن طعن نہیں کرتا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ تو درکنار، ہم تو ائمہ کرامؒ کو بھی قابلِ تعظیم اور ان کی کوششوں کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک کی ہر اک بات کو ہم من و عن تسلیم کر لیں جبکہ ہمارے پاس ایک معیار موجود ہے کہ دین کی ہر ایک بات کو کتاب و سنت پر پیش کیا جانا چاہیے۔ اب اگر کسی بزرگ کی بات اس معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے ناقابلِ قبول سمجھی جائے تو اس سے لعن طعن کا کونسا پہلو نکلتا ہے؟ اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھاؤں گا۔

امام نسائی نے اپنی سنن (کتاب الحج) میں مروان بن حکم سے روایت کی، کہ میں حضرت عثمانؓ کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے حضرت علیؓ کو عمرہ اور حج دونوں (یعنی حج قران) کی لبیک کہتے ہوئے سنا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو اس سے منع فرمایا اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ:

"فَلَمْ اَدَعْ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِكَ"۔

(نسائی، کتاب الحج، باب القران)

"میں تمہارے قول کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

قول کو نہیں چھوڑ سکتا۔"
غور فرمائیے۔ حضرت عثمانؓ اپنے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ کو عملاً اس بات سے منع کرتے ہیں۔ (جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؓ کو پہلے اس کا علم نہ تھا) لیکن حضرت علیؓ نے آپؓ کے قول کی کوئی پرواہ نہ کی تو پھر دوسرے ائمہ کرام یا بزرگانِ دین کس شمار و قطار میں ہیں ؟

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والدِ محترم سے حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ سے کہا کہ "میں تو آپ کو رسول اللہ کا قول سناتا ہوں اور آپ اپنی بات کرتے ہیں"۔ غرضیکہ ایسی مثالیں دورِ صحابہؓ میں کافی مل جاتی ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا حضرت عمرؓ کو یہ جواب لعن طعن کیسے کہلا سکتا ہے ؟

ائمہ و مشائخ کے اقوال کو حجت سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔

اب ان ائمہ کرام اور بزرگانِ دین کی مشترک اور متوارث کوششوں کا دوسرا پہلو بھی سامنے لائیے۔ ان حضرات کی ہر بات کو قابلِ اتباع سمجھنے کا دوسرا نام تقلیدِ آباء یا آباء پرستی ہے۔ جسے قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر مردود قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے یہی ائمہ کرام اور بزرگانِ دین تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

"اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔"

"انہوں نے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنا لیا تھا"

اس آیت سے متعلق جب عدیؓ بن حاتم ___ جو پہلے عیسائی تھے ___ نے رسول اللہ سے پوچھا کہ "یارسول اللہ ! ہم اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں سمجھتے تھے" تو رسول اللہ نے جواب دیا "کیا تم ان کے تبلائے ہوئے حلال کو حلال، اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے ؟" عدیؓ بن حاتم نے جواب دیا "ہاں یہ بات تو تھی" تو آپؐ نے فرمایا، "رب بنانے کا یہی مطلب ہے" (ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

گویا یہود و نصاریٰ کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ بزرگانِ دین اور ائمہ کرام شریعت کو ہم سے بہتر سمجھتے اور ہم سے بہت زیادہ نیک اور متقی تھے لہٰذا وہ دین کی باتوں کو شریعت کے اصل ماخذ پر پیش کرنے کی بجائے انہی بزرگوں اور ائمہ کرام کے اقوال و ارشادات کو قابلِ اتباع سمجھ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ دین ہمیں انہی بزرگانِ دین کی مشترک اور متوارث کوششوں سے پہنچا ہے۔

فرقہ پرستی کی اصل بنیاد۔

اور تیسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ دین میں جب کبھی بھی بگاڑ پیدا ہوا ہے، تو انہی ائمہ کرام اور مشائخ عظام کے اقوال و ارشادات کو حجت اور واجب اتباع سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یہی بات فرقہ پرستی کی بنیاد بنتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

وَھَلْ اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَّ رُھْبَانُھَا

یعنی "دین کو تباہ و برباد کرنے والے تین ہی گروہ ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ، علماء سوء اور بزرگانِ دین"

اسی لیے امام مالکؒ رسول اللہ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے:
"صرف یہی وہ ہستی ہے جس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ باقی رہے دوسرے لوگ، تو ان کی باتوں کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی۔

اور امام بخاریؒ نے تو "کتاب الاعتصام بالسنۃ" میں ایک مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے:

"آنحضرتؐ کے سامنے ایک بات کی جائے اور آپؐ اس پر انکار نہ کریں تو یہ حجت ہے۔ آپؐ کے سوا کسی اور کی تقریر حجت نہیں"

۱۰۔ بڑی جماعت یا سوادِ اعظم کا مفہوم؟

"بڑی جماعت یا سوادِ اعظم سے موصوف نے "اکثر علماء" مراد لی ہے۔ اگر ان کا یہ مفہوم درست سمجھا جائے تو یہ بات بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

تشریحات کو اپنی اور اپنے چند ہم خیالوں کی تحریروں میں مقید سمجھے ہوئے ہیں۔

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (التوبۃ : ۳۴)

"اے ایمان والو علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو ناحق لوگوں کے مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

گویا علماء و مشائخ کی اکثریت خدائی احکام کی غلط تعبیر پیش کر کے ایک تو لوگوں سے پیسے بٹورتی ہے اور دوسرے شریعت کی راہ میں روک بن جاتی ہے۔ اور رہبان یعنی مشائخ عظام یا بزرگان دین کے متعلق بھی بالوضاحت فرمایا کہ،

"وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ" (الحدید : ۲۷)

"ان میں سے اکثر فاسق ہوتے ہیں۔"

ان آیات کی روشنی میں محض علماء کی اکثریت کو کیسے واجب الاتباع قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

بڑی جماعت سے حقیقتاً وہ جماعت مراد ہے جو نظام خلافت قائم کرتی یا رکھتی ہے۔ آپؐ کے ایسے ارشادات کا تعلق سیاسی امور سے ہے۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:۔

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ ، وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاَمِیْرِ، وَلَا اَمِیْرَ اِلَّا بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ۔

اسلام جماعت کا متقاضی ہے اور جماعت امیر کی اور امیر کی امارت تب ہی مستحکم ہو سکتی ہے کہ اس کی بات سنی اور اس کی اطاعت کی جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت درج ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے:۔

"حضرت عرفجہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر مجتمع ہوں۔ پھر کوئی دوسرا شخص تمہاری قوت کو توڑے یا تفرقہ ڈالے تو اسے قتل کر دو۔" (مسلم۔ کتاب الامارہ والقضاء)۔

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا اور جماعت سے الگ ہوا پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔" (مسلم۔ حوالہ ایضاً)۔

آخر ایسا مسئلہ جس پر اکابر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہو کی مخالفت کرنا کونسی دینی خدمت ہے؟ جبکہ سماعِ موتٰی کے باب میں اکابر علماء نے بھی قرآن وسنت ہی سے استدلال کیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"بالجملہ کتاب وسنّت مملوو مشحون اند کہ دلالت می کند بر وجود علم موتٰی را بدنیا واہلِ دنیا پس منکر نشود آں را جاہل باخبار ومنکرِ دین۔"

(اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص۴۰۱)

ترجمہ: "مختصر یہ کہ کتاب وسنّت ایسے دلائل سے بھرپور ہیں جو اموات میں دنیا و اہلِ دنیا کے علم ومعرفت اور احساس وشعور پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا سماعِ اموات کا منکر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اخبار و روایات سے بے خبر ہو یا پھر ضروریاتِ دین کا منکر!"

۷۔ سماعِ موتٰی پر اجماعِ اُمّت؟

سماعِ موتٰی کے مسئلہ پر اجماع تو صحابہؓ میں بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر آپ کون سے اکابر علماء امت کے اجماع کی بات کرتے ہیں؛ علاوہ ازیں ہم پہلے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص۴۰۵، کے حوالہ سے بتلا چکے ہیں کہ صرف ایک عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتٰی کو درست سمجھ کر رسول اللہ کی قبر مبارک پر آکر سلام کہتے تھے۔ دوسرے کسی صحابی سے یہ عمل ثابت نہیں۔

۸۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی اور پیرانِ پیر کی نماز۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی وہ محدث ہیں جنھوں نے سماعِ موتٰی کو بنیاد بنا کر "صلوٰۃ غوثیہ" یا پیرانِ پیر کی نماز" تک کو جائز اور درست تسلیم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"آپ (سید عبدالقادر جیلانی) نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکار پر درود بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حاجت برای کرے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے)۔" (اخبار الاخیار مصنفہ عبدالحق محدث

حضرت سراج الہند مولانا شاہ عبد العزیز ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"بالجملہ انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بودن او شبہ نیست"

ترجمہ: "مختصر یہ کہ اگر اموات کے احساس و شعور کا انکار کفر نہ ہو مگر منکر کے الحاد و بے دینی میں شبہ نہیں ہے۔"

دہلوی۔ مترجم اردو سبحان محمود ص ۱۴۹، ۱۵۰، نیز دیکھیے، سیرۃ غوث الثقلین مصنفہ ضیاء اللہ قادری ص ۲۴۲)

غور فرمائیے، محدث صاحب کے اس پورے بیان میں صرف آخری ایک روایت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلا شک و شبہ تحقیق شدہ ہے۔ اور یہ بات سہے بھی قرین قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو، وہاں صرف گیارہ قدم جانب عراق (بغداد جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی جانب (رخ) تلاش کرنے سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (الفاتحۃ: ۴)

("اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔"

اور دوسری طرف عبد الحق محدث صاحب کا یہ تحقیق شدہ بیان ہے۔ ان میں مناسبت و موافقت آپ خود ملاحظہ فرمالیجئے۔ محدث صاحب نے جن بلند پایہ مراجع سے تحقیق فرمائی ہے، وہ یہ ہیں:

بہجۃ الاسرار، قلائد الجواہر، زبدۃ الآثار، نزہۃ الخاطر الفاتر اور تفریح الخاطر۔

دیکھئے ان میں کوئی بھی حدیث کی کتاب ہے؟ —— یہ ہے، اکثر علماء کے اقوال کو واجب للاتباع سمجھنے کا نتیجہ!

۵ اموات کا احساس و شعور۔

اموات کے احساس و شعور سے کسے انکار ہے؟ اگر ان میں احساس و شعور نہ ہو تو قبر کا عذاب کیسے ہو سکتا ہے اور اموات جنت کے فوائد سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس احساس و شعور سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اہل دنیا کی باتیں بھی سن سکتے ہیں؟

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کے قرآنِ مجید سے انکارِ سماع سے متعلق دلائل اور اُن کا تجزیہ

دلیل نمبر ۱ : والذین یدعون .... ترجمہ " اور جنھیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وُہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ وُہ تو خود پیدا شدہ ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان۔

کیلانی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اموات غیر احیاء کا اطلاق نہ جنّوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر ...... باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

کیلانی صاحب کا اخذ کردہ یہ نتیجہ چند وجوہ کی بناء پر باطل ہے۔ فوت شدہ بزرگوں میں انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، صالحین بھی داخل ہیں۔ انبیاء کرام کی حیات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ؛

واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا اجعلنا من دون الرحمٰن ؑ یعبدون۔ [۱۰]

ترجمہ۔ وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے پوچھ

عہ من دون الرحمٰنِ الٰهة ... (ادارہ)

اسی عالم دنیا میں ایک سویا ہوا شخص پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا، تو دوسرے عالم یعنی عالمِ برزخ میں پہنچا ہوا شخص اس عالم دنیا کی باتیں کیونکر سن سکتا ہے؛ بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سویا ہوا شخص احساس و شعور رکھتا ہے۔ اور اسی احساس و شعور کی وجہ سے خواب میں چلتا پھرتا، باتیں کرتا اور سنتا ہے۔

[۱۰] قرآنی دلیل ۱ کا جواب

یہاں لفظ " واسئل " کا ترجمہ بعض مترجمین نے " پوچھو " کے بجائے " احوال دریافت کرو " بھی کیا ہے (مثلاً فتح الحمید ترجمہ فتح محمد جالندھری) تاہم حاشیہ میں اکثر مفسرین نے وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد ان رسولوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہے مثلاً ؛

لیجئے کہ ہم نے ذاتِ رحمٰن جلّ وعلیٰ کے بغیر کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے یقیناً ایسا نہیں۔

۱۔ ترجمہ شاہ رفیع الدین حاشیہ موضح القرآن (شاہ عبدالقادر): "ف یعنی ان رسولوں پر جو کتابیں اتری تھیں ان کو دیکھ لے یا ان کی امت کے لوگوں سے پوچھ لے"۔

۲۔ موضح القرآن از وحیدالزمان نے بھی حاشیہ پر بالکل یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔

۳۔ تفہیم القرآن: "۴۵ رسولوں سے پوچھنے کا مطلب ان کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات انہیں سکھا دی کہ اللہ جلّ شانہ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے؟

۴۔ ترجمہ رضا خاں بریلوی (کنز الایمان) اور حاشیہ نعیم الدین مراد آبادی: "۴۵ رسولوں سے سوال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ادیان و ملل کی تلاش کرو۔ کہیں بھی کسی نبی کی امت میں بُت پرستی روا رکھی گئی ہے؟ اور اکثر مفسرین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ مومنین اہلِ کتاب سے دریافت کرو۔ کیا کسی نبی نے غیر اللہ کی عبادت کی اجازت دی؟ تاکہ مشرکین پر ثابت ہو جائے کہ مخلوق پرستی نہ کسی رسول نے بتائی نہ کسی کتاب میں آئی۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ شبِ معراج سیدِ عالم نے بیت المقدس میں تمام انبیاءؑ کی امامت فرمائی۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے جبریلؑ نے عرض کیا کہ اے سرورِ اکرمؐ، اپنے سے پہلے انبیاءؑ سے دریافت فرمائیے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی اور کی عبادت کی اجازت دی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سوال کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی اس میں کوئی شک ہی

اگر انبیاء کرام میں حیاۃ نہ ہوتی، وُہ خطاب وندا کو نہ سمجھتے ہوتے اور جواب

نہیں کہ تمام انبیاءؑ توحید کی دعوت دیتے آئے۔ سب نے مخلوق پرستی کی ممانعت فرمائی"

اب دیکھیے ہم نے چار مختلف مکاتب فکر کے مفسرین کے حواشی پیش کر دیے ہیں۔ اور چاروں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ یہاں "وَاسْئَلْ" سے مراد ان کی کتابوں سے یا مومنین اہل کتاب سے معلوم کرنا ہے۔ نہ کہ گزشتہ رسولوں سے دریافت فرمانا۔ اور پانچویں فتح محمد جالندھری بھی ہیں۔ جنھوں نے ترجمہ میں ہی یہ مسئلہ حل کر دیا۔ البتہ کنز الایمان کے مفسر نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے ایک روایت بھی درج فرمائی۔ اور یہی روایت جناب محمد علیؒ صاحب مضمون کو بھی پسند آئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مضمون میں یہ روایت تفسیر کبیر ج، ص ۴۳۰ کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ لیکن یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ سورۃ زخرف کی یہ آیت واقعہ معراج سے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل، جس میں مسجدِ اقصیٰ کے واقعہ کا ذکر ہے، کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۵۰ ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۶۳ ہے۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے دو سال قبل کا ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف اس وقت نازل ہوئی جبکہ کفار آپؐ کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۷۹، ۸۰ سے واضح ہے۔ لہٰذا قبل از نزول آیت مذکورہ، جبریلؑ کا حضورؐ سے یہ کہنا کہ "ان رسولوں سے پوچھ لیجئے۔ اور پوری آیت پڑھ جانا— یہ کیسے ممکن ہے؟

وضعی روایت اور سماعِ موتی۔

پھر اگر اس روایت کو درست بھی تصور کر لیا جائے تو بھی اس پر درج ذیل اشکال وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ مسجد اقصیٰ میں سوا لاکھ پیغمبروں کے (برزخی زندگی میں) جمع ہونے کے علاوہ، اس سے قبل، تمام بنی نوعِ انسان کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت بھی

کی قدرت ان میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل سے دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔

کنز العمال میں حدیث ہے۔ من صلّی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی من بعید علمتہ۔ (ابو شیخ عن ابی ہریرۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کے پاس درود پڑھا میں خود سنتا ہوں اور جس شخص نے مجھ پر دُور سے درود پڑھا میں اس کو جانتا ہوں۔

حدیث ۲: عن ابی ھریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حاضر کیا تھا جب ان سے عہد "الست" لیا تھا۔ اور اس دور کو خدا تعالیٰ نے موت کا دَور کہا ہے تو پھر تو سماعِ موتیٰ کے قائلین کو اس معراج والے سوال جواب کے بجائے اس واقعہ سے ثبوت پیش کرنے کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ اس موت کے دور میں روحوں نے صرف سنا ہی نہیں تھا بلکہ جواب بھی دیا تھا۔

۲- جبریلؑ نے حضور اکرمؐ سے کہا بھی کہ انبیاءؑ حاضر ہیں۔ ان سے سوال کیجئے۔ لیکن آپؐ نے پھر بھی سوال نہیں کیا تو اس آیت پر عمل کیا ہوا؟

۳- پھر جب آپؐ نے سوال ہی نہیں کیا، نہ ہی انبیاءؑ کی ارواح نے کچھ جواب دیا تو سماعِ موتیٰ ثابت کیسے ہوا؟ اور اس روایت سے آپ کا استدلال درست کیونکر؟

ان تصریحات سے البتہ یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "وَاسْئَلْ" کا حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ یعنی اگر آپؐ چاہیں تو سابقہ انبیاء کی کتب یا ان یہود و نصاریٰ کے مومنین یا بمصداقِ روایتِ بالا انبیاءؑ کی ارواح سے پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپؐ کو یقین تھا کہ ایسی بات کا کسی الہامی کتاب میں لکھا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا آپؐ نے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھا اور نہ ہی سماعِ موتیٰ کے استنباط کی گنجائش باقی رہی۔

۱۱ دوسری وضعی روایت۔

اس موضوع حدیث پر پہلے ص ۳۵ پر بحث گزر چکی ہے۔

مامن احد یسلم علی الا علی روحی ارد علیہ رواہ الطبرانی فی الاوسط

"رسول اللہ علیہ اسلام نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھے مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر رُوح کو لوٹاتا ہے تاکہ میں اس کا جواب[۱۲] دوں" اور کوئی وقت ایسا نہیں جب آپ پر درود وسلام نہ پڑھا جائے۔ آپ ہر وقت صلوٰۃ وسلام کا جواب روح بمعہ جسم ہی عطا فرماتے ہیں۔

اب کیلانی صاحب ہی بتائیں کہ ان بزرگ ہستیوں انبیاء کرام کو ایک مسلمان کیسے بے جان لاشیں تصور کرے۔ شہداء سے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ جو لوگ اللہ تبارک تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کی لاشیں بے جان نہیں[۱۳] کیلانی صاحب حقیقت یہی ہے کہ سورۃ نحل کی

---

۱۲ چوہدری صاحب نے اپنے مضمون میں عربی عبارات اکثر غلط لکھی ہیں۔ بیشتر اعراب کے بغیر بھی ہیں جبکہ اردو عبارت میں اکثر پنکچویشن کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ادارہ محدث اگرچہ اعراب اور صحتِ لفظی وغیرہ کا خصوصی التزام کرتا ہے لیکن ہم نے چوہدری صاحب کی عبارات کو نہ درست کیا ہے نہ ان پر اعراب وغیرہ لگائے ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ ان کا مضمون من وعن شائع ہو ورنہ قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس حدیث کی عبارت کو انہوں نے مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیا ہے۔ حالانکہ کیلانی صاحب کے جس مضمون پر وہ تعاقب کر رہے ہیں، اسی مضمون سے اس کی صحیح عبارت نقل کی جا سکتی تھی، جو یوں ہے: "مَا مِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ" (محدث جلد ۱۲ عدد ۲-۳ ص۱۴)

یہ وضاحت اسلئے کر دی ہے کہ قارئین کرام عدم صحت عبارات کو ادارہ کا تساہل نہ سمجھیں۔ (ادارہ)

---

۱۳ تیسری وضعی روایت۔

طبرانی کی اس حدیث پر بھی ص ۲۵ پر بحث گزر چکی ہے۔

۱۴ شہداء کی زندگی ہمارے جیسی نہیں۔ اگر ہمارے جیسی ہوتی تو ہم اسے ضرور سمجھ سکتے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ قبروں میں پڑے ہوئے بزرگ زندہ ہیں ہماری بات سنتے، جواب دیتے اور ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں تو ایسی زندگی کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور یہ بات نصِ قرآنی کے خلاف ہے، نیز دیکھئے ص۱۳ اور ۱۰۰ کتاب ہذا۔

یہ آیت مبارکہ کفار کے معبودانِ باطل بتوں وغیرہ کے حق میں نازل شدہ ہے۔

دلیل۔۲۔ ترجمہ۔ زندہ اور مردے برابر نہیں ہوسکتے اللہ جس کو چاہے سنا سکتا ہے لیکن (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ فاطر-۲۲

اس آیت سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اللہ سنا سکتا ہے۔

دلیل نمبر۔۳۔ ترجمہ۔ اور اس شخص سے بڑھکر کون گمراہ ہوگا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روز قیامت) اکٹھے کیے جائیں گے۔ تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی پرستش سے انکار کردیں گے (الاحقاف ۵، ۶)

کیلانی صاحب کی تشریح۔ آیت نمبر۳ میں وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کردیتے ہیں کیونکہ وہ دعائیں سن سکتے ہیں اور كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً کے الفاظ بتوں اور مظاہرِ قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کردیتے ہیں ... اب صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

مولانا کیلانی صاحب کا یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ بزرگوں کے[۱۵۱] ساتھ بغض وعناد سے محفوظ رکھے۔

---

[۱۵۱] بزرگوں سے بغض وعناد؟۔ بزرگوں سے بغض وعناد سے مراد اگر فوت شدہ بزرگوں کو زندہ تسلیم نہ کرنا، اور تصرف فی الامور یا الوہیت میں انہیں خدا کا شریک وسہیم نہ سمجھنا ہے تو ہم واقعی اپنے اس "جرم" کا اقرار کرتے ہیں۔ تاہم ایک بات پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آخر خود رسول اللہ ؐ کو ان بزرگوں سے کیا بغض وعناد تھا، جن کے مقبرے، گنبد اور مزارات کو آپ ؐ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر حکماً مسمار کرادیا تھا؟ کیا اس کی وجہ یہی نہ تھی کہ وہ لوگ ایسے ہی عقائد میں مبتلا تھے؟

مولانا موصوف کے اس استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے واضح کیا جائے گا۔
پہلے اس بارے میں اقوالِ مفسرین پیش کیے جاتے ہیں۔
امام ابن کثیر فرماتے ہیں ای لا اضل ممن یدعو من دون
اللہ اصناما و یطلب منہا مالا تستطیع الی یوم
القیامۃ وھی غافلۃ عما یقولون لا تسمع ولا تبصر
ولا تبطش لانہا جماد حجارۃ صم۔ جلد ۴ ص۱۵۴
ترجمہ۔ یعنی کوئی اس شخص سے زیادہ گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ بتوں کی عبادت کرتا ہے اور ان سے ایسے اُمور کی استدعا کرتا ہے جن کی قیامت تک ان میں استطاعت و قدرت نہیں اور وُہ ان کے اقوال سے غافل ہیں، نہ سنتے اور دیکھتے ہیں اور نہ ہی پکڑ سکتے ہیں کیونکہ وُہ بے جان پتھر ہیں اور قوتِ سماع سے عاری
۲ تفسیر خازن میں ہے من لا یستجیب یعنی الاصنام لا تجیب عابدیہا
الی شیئ یسئلونہا۔
ترجمہ۔ من لا یستجیب سے مراد بُت ہیں جو اپنے عابدوں کو وُہ اشیاء مہیا نہیں کر دیتے جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر ہے۔
۳ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ میں ہے (الی یوم القیامۃ) و
انما جعل ذلک غایۃ لان یوم القیامۃ قد قیل انہ تعالیٰ یحییہا
وتقع بینہا وبین من یعبدھا مخاطبۃ فلذلک جعلہ
حدا واذا قامت القیامت وحشر الناس فہذہ الاصنام
تعادی ھؤلاء العابدین وتتبرء منہم۔ جلد، ص۴
ترجمہ۔ معبودانِ باطلہ کے جواب نہ دینے کی حد یوم القیامۃ مقرر فرمائی (جس سے لازم آئے گا کہ قیامت کے دن وہ ان کو جواب دیں گے۔ حالانکہ بت تو قیامت کے دن بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی نے فرمایا) کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو زندگی بخشے گا اور ان کے درمیان اور مشرکین کے درمیان گفتگو ہوگی۔ لہٰذا جواب نہ دینے کی حد قیامت کا دن بنادیا اور جب قیامت قائم ہوگی، تمام لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، تو یہ بُت

اپنے عابدوں کے دشمن بن جائیں گے، ان سے اور ان کی عبادت سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اس کے علاوہ دیگر کتب تفاسیر میں بھی اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے اور من لا یستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غفلون کے مصداق صرف اصنام و اوثان کو بنایا گیا ہے۔[۱۵]

کیلانی صاحب کے استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے

حضرت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم انتم لھا واردون۔

ترجمہ۔ بے شک تم خود اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو سب کے سب جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے اور بقول کیلانی صاحب یہ عبادت بزرگوں کی ہے جس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام سبھی شامل ہیں تو ان کا

---

۱۵ من دُونِ اللہ سے مراد؟ چودھری صاحب بعض سماع کے قائل مفسرین کے حوالہ سے ثابت فرما رہے ہیں کہ من دون اللہ سے مراد صرف بُت ہیں حالانکہ قرآن و حدیث میں بہت سے آلِہَۃً مِّن دُونِ اللہ مذکور ہیں مثلاً شمس و قمر شِعریٰ (ستارہ) اصنام، اوثان۔ طاغوت۔ جن، ملائکہ انبیاء اور اولیاء۔ آیت بالا میں وَاِذَا حُشِرَ النَّاس کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں مِن دُونِ اللہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے جنہیں پکارا جاتا تھا نہ کہ پتھر کے اصنام کی۔ سہارا اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن پتھروں کے اصنام کو اکٹھا کر سکتا اور انہیں قوت گویائی بخش سکتا ہے مگر جب اس آیت میں ایسا کوئی قرینہ ہی نہیں تو محض قدرت الٰہی کا سہارا لے کر یہاں مِن دُونِ اللہ سے صرف اصنام مراد لینے کی کیا تُک ہے۔ سماع کے قائل حضرات دراصل انبیاء و اولیاء کو عَنْ دُعَائِھِم غَافِلُوْن سے مستثنیٰ قرار دینا چاہتے ہیں مگر کتاب و سنت اس سے ابا کرتے ہیں۔
قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھیں گے: کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو مِن دُونِ اللہ الٰہ بنا لو؟ اس سوال و جواب کا آخری حصہ عیسیٰؑ کا یہ جواب ہے کہ جب تک میں ان میں تھا۔ ان کے حالات سے باخبر رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو ان کا نگراں تو ہے (۵/۱۱۷) اب اگر عیسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر جنہیں موت آئی ہی نہیں اور بجسد عنصری آسمان پر زندہ ہیں عَنْ دُعَائِھِم غٰفِلُوْن کا خود اقرار کر رہے ہیں تو دوسروں کے لیے یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے؟

جہنم میں داخل ہونا اور نار دوزخ کا ایندھن بننا لازم۔ نعوذ باللہ منہ۔ جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی محبوب ہستیوں سے متعلق فرماتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون۔

ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ان الذین سبقت لہم منا الحسنی اولئک عنہا مبعدون لا یسمعون حسیسہا وھم فیما اشتہت انفسہم خالدون لا یحزنہم الفزع الاکبر و تتلقہم لملا ئکۃ ھذا ہ یومکم الذی کنتم توعدون۔ ترجمہ۔ تحقیق وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے۔ وہ نار جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ نار جہنم کی آواز ذرہ بھر بھی نہ سنیں گے اور اپنی پسندیدہ نعمتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے انہیں سب سے بڑی گھبراہٹ (دہشت قیامت وغیرہ) غم میں نہیں ڈالیں گے اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ ہے وہ دن جیسا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

تفسیر ابوالسعود میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ " انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم انتم لہا واردون لو کان ھؤلاء الھتۃ ما وردوھا وکل فیہا خلدون۔

اے مشرکین تم اور تمہارے معبودان باطلہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم سب اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر تمہارے معبود درحقیقت الٰہ ہوتے تو دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوتے۔ اور یہ سب ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں"، کو مشرکین پر تلاوت کیا تو ابن زبعری نے کہا کہ ہمارے بت اور اصنام اگر جہنم میں داخل ہوں گے، تو عیسائی حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں

ے انا للہ! — قرآن مجید کی آیات تک غلط لکھ دی ہیں۔ صحیح الفاظ یوں ہیں، وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي ...... (ادارہ)

ے اٰلِهَةً (ادارہ)

اور یہودی حضرت عزیرؑ کی پرستش کرتے ہیں اور نبی ملیح ملائکہ کی پوجا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی جہنم میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان بد باطنوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ یا دوسرے اولیاء اور شہداء اور صلحاء کے لیے ہماری طرف سے وعدہ خیر اور پیمان جود و عطا ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ انجام نہیں۔ یہ صرف تمہارے معبودات باطلہ اور ارباب من دون اللہ کا انجام بد اور عاقبت قبیحہ ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ اصنام وانصاب اور صور و تماثیل کے حق میں وارد آیات کا انبیاء کرام رسل عظام اور اولیاء شہداء اور صالحین پر چسپاں کرنا محض جہالت اور قرآن وسنت کی قبیح ترین تحریف ہے بلکہ قرآن مجید فرقان حمید کی بہت سی آیات سے سماعِ موتیٰ ثابت ہوتا ہے۔

۶۔ معبودانِ باطل اور بزرگ ہستیاں۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی نبی، رسول، شہید اور صالح کی عبادت کی ہے تو اس آیت "اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ" کے بموجب یہ بزرگ ہستیاں معبودانِ باطل کی عفونت سے مستثنیٰ ہی رہیں گی۔ البتہ ان کو پوجنے والے ضرور جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم، لیکن اس سے سماعِ موتیٰ کیسے ثابت ہو گیا؟ یہ عقدہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ شاید اس پر موصوف کچھ روشنی ڈال سکیں۔ اس سے تو الٹا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سماعِ موتیٰ کو درست سمجھ کر انہیں پکارتے رہے یا عبادت کرتے رہے ہیں ان کو ان کے اس جرم کی سزا یہ ملے گی کہ وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ رہی یہ بزرگ ہستیاں تو چونکہ ان کا اپنا کوئی قصور نہیں، لہٰذا انھیں دوزخ سے دور رکھا جائے گا اور جو بتوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو وہ بھی محض مشرکین کے اس زعمِ باطل کی تردید اور مزید حسرت و یاس کے احساس دلانے کے لیے ہو گا۔ ورنہ پتھر کے بتوں کا اپنا کیا قصور ہو سکتا ہے اور جہنم میں داخل کرنے سے انہیں کیا نقصان پہنچے گا؟

جناب محمد علی صاحب لکھتے ہیں:

"بلکہ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات سے سماعِ موتیٰ ثابت ہوتا ہے۔"

ثبوت نمبر۔ قال اللہ تعالیٰ واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا أجعلنا من دون الرحمٰن الھۃ یعبدون۔

ترجمہ۔ وہ رسول ونبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرماتے ان سے پوچھ لیجئے[شلہ] کیا ہم نے ذات رحمٰن جل وعلیٰ کے بغیر کئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جاتے یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اگر انبیاء کرام میں حیات نہ ہوتی وہ خطاب وندا کو نہ سمجھتے تو حق تعالیٰ اپنے محبوب کو دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔ تفسیر کبیر جلد سابع صنہ۲۳۰ پر ہے "عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ جب شب اسرای نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجدِ اقصیٰ پہنچایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد میں سے تمام رسولوں کو آپ کے لیے مسجدِ اقصیٰ میں جمع فرمایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اذان دی اور اقامت کی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھیے اور نماز پڑھایئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت جبرائیل نے عرض کیا ان رسولوں سے جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے سے دریافت کریجئے (جیسا کی آیت میں ہے) آپ نے فرمایا لا اسئال لانی لست شا کا فیہ۔ میں نہیں پوچھتا مجھے کوئی شک نہیں۔

ثبوت نمبر۲۔ قال اللہ تعالیٰ۔ وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا[عـہ] فی دارھم جٰثمین فتولیٰ عنھم وقال یقوم لقد ابلغتکم رسالۃ ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین۔

اب درج بالا آیت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کی تو ہم نے وضاحت کردی ہے۔ باقی جو آیات درج فرما کر آپ نے ثبوت پیش کیے ہیں وہ "واسئل" کے الفاظ سے شروع ہونے والی آیت کے علاوہ صرف ایک مزید آیت ہے جو[۱۹ شلہ] کے تحت زیرِ بحث آرہی ہے۔

[شلہ] اس آیت پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

عـہ فاصبحوا فی دارھم پ۱۰۰ (ادارہ)

ترجمہ۔ (قوم صالح علیہ السلام نے ان سے کہا) اے صالح جس عذاب کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے وہ ہمارے پاس لے آ، اگر تو درحقیقت مرسلین میں سے ہے۔ تو زلزلہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پس وُہ لوگ اپنے گھروں میں تباہی و بربادی سے دوچار ہو گئے اور علیحدہ ہوتے وقت ان سے مخاطب ہو کر کہا اے میری قوم میں نے تمہیں رب کے پیغام پہنچائے اور نصیحت کی، لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

امام رازی نے تفسیر میں فرمایا" پہلا قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی علیحدگی ان کی ہلاکت کے بعد پائی گئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ فا تعقیب اور فوری ترتب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اعراض ہلاکت کے بعد متحقق ہوا اور انہوں نے قوم کی ہلاکت کے بعد انہیں خطاب فرمایا جیسا ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر[ھلہ] کے مقتول کو خطاب فرمایا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ ان مرداروں کے ساتھ کلام فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں لیکن وہ لوگ ایسے جواب پر قادر نہیں جو تم سن سکو۔ خلد رابع ص۲۵۵ قال ابوالسعود خاطبهم عليه الصلوة والسلام بذلك خطاب رسول الله صلى الله عليه وسلم اهل قليب بدر حيث قال انا وجدنا ما وعدنا ربنا فهل وجدتم ما وعد كم ربكم حقا۔ جلد رابع ص۲۱۸

علامہ ابوالسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی ہلاک شدہ قوم کو ایسے

ھلہ نہ ہمیں قلیب بدر کے واقعہ سے انکار ہے نہ ان مفسرین کی تفسیر سے۔ یہ سب صورتیں معجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور استثنائی صورتیں ہیں۔ لہٰذا ان واقعات سے علی الاطلاق سماع موتیٰ ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس بات سے آخر کسے انکار ہے کہ اللہ جب چاہے مُردوں کو سنا سکتا ہے۔ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ آیا ہم لوگ بھی مُردوں کو سنا سکتے ہیں؟ یا عام حالات میں وہ ہماری بات بھی سن سکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ واقعات ایسا ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ بلکہ الٹا قرآنی نصوص اس کا ردضرور ثابت کرتی ہیں۔

ہی خطاب فرمایا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کنویں میں پھینکے ہوئے کفار سے خطاب فرمایا۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد خطاب فرمایا۔

ثبوت نمبر ۳۔ والنازعٰت غرقًا والناشطٰت نشطًا والسابحات سبحًا فالسابقات سبقًا فالمدبرات امرًا۔

قسم ہے ان نفوسِ قدسیہ کی سختی سے جان کھینچیں اور نرمی سے بند کھولیں اور آسانی سے تیریں پھر آگے بڑھ کر جلد پہنچیں، پھر کام کی تدبیر کریں۔

مفسرین کرام نے صفات مذکورہ کو ملائکہ کے علاوہ نفوسِ کاملہ اور ارواح فاضلہ پر بھی منطبق فرمایا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں "آیت مذکورہ میں ان نفوسِ فاضلہ کے ساتھ قسمیں ذکر کی گئی ہیں جو موت کی وجہ سے ابدان سے بزور الگ[۹۵] کیے جاتے ہیں کیونکہ بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی

---

۹۵ "وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا" کی تفسیر جو آپ نے روح المعانی کے حوالہ سے پیش فرمائی ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کے خلاف ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ سب نے یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں نہ کہ نفوسِ فاضلہ۔ اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ کنز الایمان کے حاشیہ نویس جناب نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے بھی یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں کیونکہ فرشتے ہی جسم میں ڈوب کر جان کو کھینچ نکالتے ہیں اور "مدبراتِ امر" بھی فرشتے ہی ہیں۔ یہاں جناب محمد علی صاحب نے جن چند مفسرین کے نام روح المعانی کی تائید میں پیش فرماتے ہیں یہ سب تصوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنھیں ہر وقت یہ فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ جہاں تک بن پڑے فوت شدہ "اولیاء اللہ" کا "تصرف فی الامور" بھی کسی طرح کتاب و سنت سے ثابت کیا جائے۔ روح المعانی کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ آپ معانی کی روح کھینچ کر ایسی تفسیر بیان فرماتے ہیں۔ متصوفین حضرات ظاہری معانی کو ہیچ سمجھ کر بعینہٖ باطنی معانی کی دریافت میں اپنی کوششیں صرف کیا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جو تفسیر صاحب روح المعانی نے پیش فرمائی ہے آیا قرآنِ کریم کے الفاظ ان معانی کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟

بہت مشکل ہوتی ہے۔ جبکہ بدن اعمالِ خیر میں ان کے لیے بمنزلہ سواری کے ہوتا ہے اور بدن میں رہنا مزید خیر و برکت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تب وہ بدنوں سے جدائی کے بعد عالمِ ملکوت کی طرف بصد شوق گامزن ہوتے ہیں اور عالمِ ملکوت میں

صاحبِ روح المعانی کے مطابق آیات نمبر (۱) اور (۲) کے معنی یا تفسیر یہ ہے:

"وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا o وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا o"

"ان نفوسِ فاضلہ کی قسم جو موت کی وجہ سے بدن سے بزور الگ کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔"

اب دیکھیے درج بالا ترجمہ یا تشریح پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ "نَزَعَ" فعل متعدی بمعنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنا ہے (مفردات) "نزع بمعنی جان کنی کا وقت" ہے اور "غرق" فعل لازم بمعنی کسی چیز کا ڈوبنا ہے۔ اب اگر یہاں نازعات، اسم فاعل بمعنے کھینچنے والیاں (اردو محاورہ کی نسبت سے کھینچنے والے) سے مراد فرشتے لیے جائیں۔ تو آیت کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ فرشتے انسان کے جسم میں ڈوب کر اس کی رُوح کو نکالتے ہیں اور یہی بات کتاب و سنّت سے بھی ثابت و مسلّم ہے۔ لیکن اگر یہاں فرشتوں کے بجائے نفوسِ فاضلہ مراد لیے جائیں تو وہ تو پہلے ہی اپنے اجسام میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے کسی دوسری چیز میں ڈوبنے اور اس کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنے کی کیا تُک ہے؟

۲۔ قرآن نے "نَازِعَاتِ" اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ بمعنی کھینچنے والے یا والیاں۔ لیکن رُوح المعانی نے اس کا ترجمہ بصورتِ مفعول "بدن سے بزور الگ کیے جاتے ہیں" کیا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہے۔

۳۔ "وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا" فرشتے تو انسان کے جسم کے بند بند اور جوڑ جوڑ سے جان نکال لاتے ہیں لیکن نفوسِ فاضلہ جو پہلے ہی جسم میں موجود ہوتے ہیں اور "بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔" وہ کیسے بند بند کو کھول سکتے ہیں؟ کیا بدن سے اُلفت و محبت کا تقاضا یہی ہے

پرواز کرتے ہوئے بارگاہِ قدس میں سبقت لے جاتے ہیں، تب اپنے مرتبہ و درجہ اور قدرت و طاقت کی وجہ سے کارکنانِ قضا و قدر میں سے ہو جاتے ہیں۔ تفسیر روح المعانی ص ۲۴ جلد ۳۰ مطبوعہ تہران۔ علامہ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں۔" لا ینبغی التوقف فی ان اللہ قد یکرم من شاء من اولیاءہ بعد الموت کما یکرمہ قبلہ بما شاء فیبرئی سبحانہ المریض وینقذ الغریق وینصر علی العدو وینزل الغیث وکیت وکیت کرامۃ لہ۔ روح المعانی جلد ۳۰ ص۲۵۔

ترجمہ۔ اس امر میں توقف و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے اولیاء کو وصال کے بعد بھی کرامتوں سے نوازتا ہے، جیسا کہ حالت حیات میں پس کبھی مریض کو ان کے ہاتھ پر بطورِ کرامت شفا بخشتا ہے۔ کبھی کسی کو غرق ہونے

کہ وہ اس کے بند بند کو خود ہی کھولنا شروع کر دیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے" وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا" کا ترجمہ یا تفسیر ہی چھوڑ دی اور اس کے بجائے جو فقرہ درج فرمایا کہ" ان نفوسِ فاضلہ کو بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے جدائی بہت مشکل ہوتی ہے؟" یہ دراصل ان کی اپنی طرف سے پہلی آیت کی مزید تشریح و تفسیر ہے۔

۴۔ جن نفوس کو اپنے بدن سے اتنی الفت و محبت ہو وہ فاضلہ ہو کیسے سکتے ہیں؟ عام نفوس کو تو فی الواقعہ بدن سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن نفوسِ فاضلہ کو بدن سے ایسی محبت قطعاً نہیں ہوتی۔ یا پھر ایسے نفوس فاضلہ ہوتے ہی نہیں۔

ترجمہ میں نفوسِ فاضلہ کے اضافہ کے فوائد۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ اہل طریقت حضرات " فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا" میں اپنے مزعومہ" اولیاء اللہ" کو شریک بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے پہلی آیت سے ہی نفوسِ فاضلہ کا لفظ شامل کر کے اس کے لیے بنیاد ہموار کرنا شروع کر دی۔ اور تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ" اس امر میں توقف و تردد کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے" اولیاء" کو مرنے کے بعد بھی کرامتوں

سے بچاتا ہے کبھی دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے تو کبھی ان کے عرض کرنے پر بارش برساتا ہے وغیرہ
علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ علامہ اسماعیل حقی۔ امام فخر الدین رازی قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب تفسیر مظہری نے بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر بیان کی ہے۔

ثبوت سماعِ موتیٰ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے!

۱۔ سماع موتی کے باب میں قلیب بدر والی حدیث مشہور و معروف ہے۔ جو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہؓ سے مروی ہے۔ ان کی روایات بخاری مسلم شریف میں موجود ہیں۔
۲۔ میت جوتیوں کی آہٹ کی آواز سنتا ہے۔ یہ حدیث بھی سماع موتیٰ پر

سے نوازتا ہے جیسا کہ حالتِ حیات میں"
سوچنے کی بات ہے کہ وفاتِ نبویؐ کے وقت چار لاکھ کے قریب مسلمان موجود تھے اور سوا لاکھ تو حجۃ الوداع کے موقعہ پر موجود تھے اور یہ دورِ صحابہ کرامؓ ۱۱۰ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اب ان چار لاکھ صحابہ کرامؓ سے پورے سو سال کے عرصہ میں صرف بارہ کرامات مذکور ہیں۔ پھر ان بارہ میں سے بھی بعض روایات ضعیف و مجروح ہیں۔ لیکن ہمارے ان اولیاء اللہ میں سے ہر ایک ولی کی زندگی کرامات سے بھرپور ہوتی ہے۔ پھر مرنے کے بعد بھی ان کی کرامات کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے۔ تو کیا ان اولیاء اللہ کے نفوس صحابہ کرامؓ سے بہت زیادہ فاضلہ ہیں جن کی کرامات اور تصرف فی الامور کا یہ عالم ہے۔؟

۲۰۔ قلیب بدر اور مُردہ کے جُوتوں کی چاپ سننے والی احادیث :

یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور ان پر میں پہلے بھر پور بحث کر چکا ہوں۔ ان میں پہلی حدیث معجزہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ایک اضطراری امر

دلالت کرتی ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۳۔ اخرج الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرو واخرج الحاکم وصححہ والبیہقی عن ابو ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ وقف علی مصعب بن عمیر حین رجع من احد فوقف علیہ وعلی اصحابہ فقال اشھد انکم احیاء عند اللہ فزوروھم وسلموا علیھم فوالذی نفسی بیدہ لا یسلم علیھم احد الا ردوا علیہ الی یوم القیامۃ

شرح الصدور ص ۸۵)

ترجمہ طبرانی نے اوسط میں عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور حاکم و بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب احد سے مراجعت فرما ہوتے تو حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے مزارات پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہو۔ پھر اپنے اطیوں صحابہ کرام اور بعد میں آنے والوں کو حکم فرمایا کہ ان شہداء کرام کی زیارت کرو اور

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی کثیر تعداد ان حدیثوں کو جاننے کے باوجود علی الاطلاق سماعِ موتیٰ کی منکر ہے۔

۲۱ ۔ طبرانی، حاکم اور بیہقی تیسرے درجہ کی کتب احادیث ہیں؛

طبرانی، حاکم اور بیہقی تینوں کتابیں تیسرے درجہ کی ہیں۔ ان سے اگر جواز ثابت ہو بھی جائے تو قابلِ احتجاج نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بالوضاحت لکھ چکا ہوں۔ کہ احادیث میں سے تیسرے اور چوتھے درجے کی احادیث سماع کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ صحاح ستہ میں سے بخاری اور مسلم اول درجہ کی، باقی چار کتابیں درجہ دوم کی ہیں۔ اور ان کے علاوہ باقی تمام کتبِ احادیث درجہ سوم اور چہارم کی ہیں۔

ان پر سلام بھیجو، مجھے اس ذاتِ اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جو شخص بھی قیامت تک انہیں سلام دے گا یہ شہداء کرام اس کا جواب دیں گے۔

اس روایت سے شہداء کا زائرین کو جاننا سلام سننا، جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ جب شہداء میں یہ چیز ثابت ہو گئی تو اولیاء کاملین صدیقین اور انبیاء کرام میں بطریق اولیٰ ثابت ہو جائے گی کیونکہ فضیلت میں شہداء تیسرے نمبر پر ہیں۔ کیا کیلانی صاحب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے بعد بھی اور کی شہادت بھی درکار ہے؟

سماعِ موتیٰ اور صحابہ کرامؓ

۴۔ روی ابن عبد البر بسند صحیح ما من احد یمر بقبر اخیه المومن کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیه الا عرفه ورد علیه السلام صححه عبد الحق ورواه ابن عبد البر فی الاستذکار والتمهید عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ (شرح الصدور ص۸۴، طحطاوی ۲۲ ص۳۶۶)۔

ترجمہ۔ ابن عبد البر نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ کوئی شخص بھی جب اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جسے صاحب قبر دنیا میں جانتا تھا۔ پس سلام دیتا ہے تو صاحب قبر اسے پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اس روایت کو محدث عبد الحق نے صحیح کہا اور ابن عبد البر نے استذکار و تمہید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۲۲۔ یہ حدیث موضوع ہے۔

یہ حدیث جو شرح الصدور اور طحطاوی کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے موضوع ہے۔ اور اسے میں موضوع حدیث ۲۷ کے عنوان کے تحت ص ۵۴ اور ۵۵ پر زیر بحث لا چکا ہوں۔ اور محدث عبد الحق صاحب کے نزدیک تو ایسی روایات بہرحال صحیح ہی ہونی چاہییں۔

۵- روی مسلم عن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال لابنہ وھو فی سیاق الموت اذا انا مت فلا تصحبنی نائحۃ ولا نار فاذا دفنتمونی فشنوا علی التراب شنا ثم اقیموا حول قبری قدر ما ینحر جزور ویقسم لحمہ حتی استانس بکم واعلم ماذا اراجع بہ رسل ربی مشکوٰۃ شریف صـ۱۴۹ باب دفن المیت۔

ترجمہ۔ مسلم شریف میں حضرت عمرو ابن العاص سے مروی ہے کہ جب وہ قریب المرگ تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوتے فرمایا جب میں فوت ہوجاؤں تو کوئی نوحہ کرنے والی عورت میرے ساتھ نہ چلے اور نہ آگ میرے ہمراہ لائی جائے (جیسا کہ رسم جاہلیت تھی) جب مجھے دفن کر چکو تو مجھ پر آہستہ آہستہ مٹی ڈالنا پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاسکتا ہے تاکہ میں تم سے انس حاصل کروں اور پورے وثوق کے ساتھ اپنے رب کے بھیجے ہوئے ملائکہ کو ان کے سوالوں کا جواب[۲۳] دے سکوں۔

---

۲۳ حدیث صحیح ہے لیکن استنباط غلط:
یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر اس کا جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے، وہ درست نہیں۔ کیونکہ یہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا اپنا خیال اور تدبیر تھی ___ اور یہ ویسا ہی خیال اور تدبیر تھی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو تاکید کی تھی کہ جب مصر پہنچو تو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اس پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

"مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا" (یوسف ۶۸)

"وہ تدبیر خدا کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوبؑ کے دل کی بس خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی"

(ترجمہ فتح محمد جالندھری)

حضرت عمرو ابن العاص نے یہ وصیت اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرو کو کی اور حضرت عبداللہ نے اسے خلاف قرآن و سُنّت نہ سمجھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اہل قبور کا زائر کو جاننا پہچاننا اور انس حاصل کرنا مشہور و معروف تھا ورنہ ان کے صاحبزادے جو خود بھی ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ضرور کہتے کہ آپ تو وہاں بے جان لاش ہوں گے میرے وہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟

اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی مختلف کتب احادیث میں سماع موتٰی کی مؤید روایات موجود ہیں۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سماع موتٰی (حضرت اُمّ المؤمنین کے انکارِ سماع پر ایک نظر)

مولانا کیلانی صاحب نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو بنیاد بنا کر مقتولین بدر اور سماعِ موتٰی پر دلالت کرنے والی تمام روایات کو مردود اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے اور ان کی روایت قبول کرنے کا سبب ان کا تفقہ بتایا ہے۔ موصوف کا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے استدلال چند وجوہ کی

تو جس طرح حضرت یعقوبؑ کی یہ تدبیر مشیت الٰہی کے مقابلہ میں بے اثر ہونے کے باوجود شریعت کے منافی نہ تھی۔ بالکل یہی صورت حضرت عمرو بن العاصؓ کی تدبیر کی ہے جو انہوں نے محض اپنی دلجمعی کے واسطے بتلائی۔ یہ تدبیر بھی کتاب و سنّت کے منافی نہیں تھی۔ تاہم یہ مطابق بھی نہ تھی۔ کیونکہ اگر مطابق ہوتی تو اکیلے حضرت عمرو بن العاصؓ کا کیا ذکر، بہت سے صحابہ کرام ایسی وصیتیں کر جاتے۔ بلکہ خود حضور اکرمؐ نے "لَقِّنُوْا مَوْتَاکُمْ" کا ارشاد فرمایا تھا، اسی طرح اس موانست کے لیے بھی کوئی ارشاد فرما دیتے۔

پھر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ بات سکرات موت کی بحرانی کیفیت میں کہی اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے بیٹے عبداللہؓ نے اس وصیت پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟

بناء پر غلط ہے۔

اول حضرت اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اپنے اجتہاد[۲۴] و استنباط پر مبنی ہے۔

دوم۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ ضابطہ و قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ جس کو واقعہ کا مشاہدہ ہے اس کا قول راجح و مختار ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت شریح ابن ہانی نے حضرت ام المؤمنین سے مسح خفین کی مدت سے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:۔

علیك بابن ابی طالب فاساء له کان یسافر مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی روایۃ علیًا فانہ اعلم بذالك منی۔ مسلم جلد اول ص۱۳۵

ترجمہ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو اور ان سے دریافت کرو وہ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ انہیں اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ علم ہے۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جس کو واقعہ کا علم زیادہ ہے اسی کا قول معتبر ہے اور اس کا علم دوسروں سے بہرحال زیادہ ہے جو موقعہ پر موجود ہو۔ چونکہ بدری صحابہ موقعہ کے گواہ[۲۵] ہیں اور خود آنحضرت کے سامنے تعجب کا اظہار کرنے حقیقت حال دریافت کرنے والے ہیں لہٰذا انہیں کا قول

۲۴ھ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سماع موتی سے انکار کی بنیاد، اجتہاد و استنباط:

حضرت امّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اگر آپؓ کے اپنے اجتہاد و استنباط پر مبنی ہے، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اپنے اجتہاد و استنباط ہی کی بناء پر سماع موتی کے قائل تھے۔ گویا وہاں بھی بات اجتہاد و استنباط ہی کی ہے!

۲۵ھ موقع کے گواہ:

چوہدری صاحب نے روح المعانی کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں۔

معتبر ہے۔

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی فرماتے ہیں" امام سہیلی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں لہٰذا ان کے علاوہ جو صحابہ کرام وہاں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہیں۔ ترجمہ جلد ۲۱ صفحہ ۵۰۔

سوم۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت "کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مقتول اس کو سن رہے ہیں" کے جواب میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا "کہ یہ مردار جانتے ہیں کہ جو کچھ میں انہیں کہا کرتا تھا وہ حق ہے۔ محدثین نے فرمایا کہ دونوں روایتوں میں تخالف نہیں ان کے لیے علم ممکن ہے تو سماع بھی ممکن ہے۔ منکرینِ سماع حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ قلیبِ بدر پر تشریف لے گئے اختلاف ہے تو صرف اس میں کہ حضور علیہ السلام

لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی قلیب بدر کے واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھے۔ ان کو جنگ بدر اور جنگ احد دونوں موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سنی کی بنا پر جہاد میں شرکت کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ انہیں پہلی مرتبہ جنگِ خندق میں شمولیت کی اجازت ملی اور اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی (دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۲ صفحہ ۸۰ زیرِ عنوان عبداللہ بن عمرؓ)

نص میں اجتہاد نہیں۔

پھر "موقع کے گواہ" کے ضمن میں چودھری صاحب نے جو حضرت عائشہؓ کے حوالے سے مثال پیش فرمائی ہے وہ قیاس مع الفارق ہے رسول اللہ صلعم کا مسح علی الخفین کی مدت بتلانا نص ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں جبکہ سماع موتیٰ کا مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جبھی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اجتہاد دوسرے صحابہ کرامؓ کے اجتہاد سے مختلف تھا۔

نے صحابہ کرام کے استفسار کا جواب[۲۶] دیتے ہوئے کیا الفاظ فرمائے۔
چہارم۔ حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ پہلے سماع کی نفی فرمائی لیکن بعد میں رجوع کر لیا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "تحقیق ذکر کردہ است در مواہب لدنیہ کہ در مغازی محمد ابن اسحاق باسناد جید و در مسند امام احمد بن حنبل باسناد حسن از عائشہ رضی اللہ عنہا مثل حدیث عمر رضی اللہ عنہ آمدہ۔ پس گویا عائشہ (رضی اللہ عنہا) رجوع کرد از

۲۶ــــ یہ معجزہ کی صورت ہے:
یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نہ تو حضرت عائشہؓ موقعہ پر موجود تھیں اور نہ عبداللہ بن عمرؓ، تو اب ہمیں لامحالہ قتادہ عن انس بن مالک عن ابی طلحہؓ کی روایت اور ان کے استنباط پر انحصار کرنا پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ نے جو الفاظ بیان فرمائے تھے، وہ یہ ہیں:
"مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ" (بخاری۔ کتاب المغازی باب قتل ابی جہل)
یعنی "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ یہ مُردے بھی ایسے ہی سن رہے ہیں جیسے تم سن رہے ہو"
اور حضرت قتادہ کا یہ استنباط بھی سماع موتیٰ کے سلسلہ میں چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ ان الفاظ سے واضح ہے کہ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

۲۷ــ سماع موتیٰ کے انکار سے حضرت ام المؤمنینؓ کا رجوع؟

یہ عبدالحق محدث صاحب کا اپنا خیال ہے۔ کوئی حدیث تو درج نہیں فرمائی، بس چند کتابوں کے نام گنوا دیے ہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا سماع موتیٰ سے انکار تو بخاری سے ثابت ہو، لیکن رجوع مواہب لدنیہ اور مغازی محمد بن اسحاق جیسی کتابوں سے؟ ــــ ہاں اگر وہ کوئی حدیث درج فرما دیتے تو مسند احمد بن حنبل کی طرف رجوع کیا جا سکتا تھا۔

انکار بسبب آنچہ ثابت شود نزد وے از روایت ثقات صحابہ کبار زیراکہ وے رضی اللہ عنہا حاضر نبود در آں قضیہ و در شرح مسلم نیز مثل ایں مذکور شد۔
مدارج النبوت، اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص۴۲۲)

باب سماع میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایات

۱۔ اخرج[۲۸] بن ابی الدنیا فی کتاب القبور عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من رجل یزور قبر اخیہ ویجلس عندہ الا استانس بہ ورد علیہ حتی یقوم۔ شرح الصدور ص۸۴

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں کوئی ایسا شخص جو کہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے مگر اسے اس کے ذریعہ اُنس اور راحت وسکون میسر آتا ہے۔ سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔ اور یہ سکون اس وقت تک حاصل رہتا ہے جبتک بیٹھا رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوگا تو یہ حالت ختم ہو جائے گی۔

۲۔ عن بن ابی ملیکۃ قال لما توفی عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بالحبشی فحمل الی مکۃ فدفن بہا فلما قدمت عائشۃ رضی اللہ عنہا اتت قبر بن ابی بکر فقالت ۔ وکنا کندما فی جذیمۃ حقبۃ ۔ من الدھر حتی قیل لن یتصدعا فلما تفرقنا کانی ومالکًا ۔ لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معًا۔ ثم قالت واللہ لو حضرتک ما دفنت الا حیث مت ولو شھدتک ما ذرتک ۔ رواہ الترمذی،

---

[۲۸] ابن ابی الدنیا کی روایات:
ابن ابی الدنیا کے متعلق پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ اس کی روایات قابلِ احتجاج نہیں۔

مشکوٰۃ شریف ص۱۴۹)

ترجمہ۔ ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ جب عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مقام حبشے میں فوت ہو گئے تو انہیں وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف منتقل کر کے وہاں دفن کر دیا گیا۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو اپنے بھائی عبد الرحمٰن کی قبر پر تشریف لائیں اور فرمایا ؎ ہم جذیمہ کے دو صاحبوں کی طرح زمانہ کا ایک طویل حصّہ اکٹھے رہے، حتیٰ کہ کہا گیا کہ یہ ہرگز جدا نہ ہوں گے اور جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں اور مالک باوجود عرصہ دراز تک اکٹھے رہنے کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رات بھی اکٹھے نہیں رہے تھے۔

پھر اپنے بھائی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، بخدا اگر میں اس وقت موجود ہوتی جبکہ آپ کا انتقال ہوا تھا تو آپ وہیں دفن کیے جاتے جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت حاضر ہوتی تو اب تیری زیارت نہ کرتی۔ شیخ عبد الحق محدث فرماتے ہیں کہ "چونکہ ازواج مطہرات کا بغیر کسی ضرورت و مجبوری کے اپنے گھروں سے نکلنا روا نہیں تھا، اس لیے فرمایا کہ میں اگر اس وقت الوداع کر لیتی تو اب زیارت نہ کرتی۔"

حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا خطاب اور الوداع کہنے کے لیے قبر پر تشریف لے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت صدیقہ کے نزدیک بھی صاحب قبر کو زائر کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کے کلام کو سنتا ہے۔

۲۵۔ حضرت ام المؤمنینؓ کا اپنے بھائی سے خطاب:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی عبد الرحمٰن بن ابو بکرؓ کی قبر کی زیارت کی، جو ان کی عدم موجودگی میں دفن کیے گئے تھے۔ اور قبر پر جا کر تمیم کے دو شعر بھی پڑھے جو اس نے اپنے بھائی مالک کی وفات پر مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔ پھر یہ کہا کہ اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو تمہیں اسی جگہ دفن کرتی۔ جہاں تم فوت ہوئے تھے اور تمہاری موت کے وقت میں موجود ہوتی تو تمہاری قبر پر

ترمذی شریف کی یہ روایت ابن ابی الدنیا کی روایت کی مؤید ہے۔ امام ترمذی کی صحیح روایت کے بعد یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ امام ابن ابی الدنیا ضعیف محدث ہے۔ ویسے جب ذہن میں پہلے ہی ایک غلط مفروضہ قائم کر لیا جاتے پھر کوئی بھی روایت ہو وہ ضعیف ہوتی چلی جاتے گی۔ احمد، حاکم کی یہ روایت بھی ان روایات کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت كنت ادخل البيت فاضع ثوبي واقول انما زوجي وابي فلما دفن عمر معهما ما

بھی نہ آتی"

اب دیکھیے ایسا خطاب تو لوگ اپنے مرے ہوتے عزیزوں کو اکثر کیا ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ سن نہیں رہے۔ اور شاعر حضرات تو ہوا کو مخاطب کر کے اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی لگا دیتے ہیں، صرف مخاطب کرنا تو بڑی آسان بات ہے۔ مثلاً اقبال کہتا ہے کہ

؎ اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تو کیا اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمالہ پہاڑ بھی میرا یہ خطاب سن رہا ہے؛ اس طرح کا طرزِ خطاب تو محض اپنے جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسی باتوں کو عقیدہ کی بنیاد بنانا آخر کہاں تک درست ہے؟ اگر آپ نے سماعِ موتی کو احادیث سے ثابت کرنا ہی تھا تو اس سے تو وہ حدیث بدرجہا مفید تھی۔ جس میں مسلمانوں کو قبرستان جا کر سلام دعا کہنے کی تلقین کی گئی ہے ——— لیکن اس کا جواب بھی ہم اپنے مضمون میں دے چکے ہیں۔

۳۔ ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟

ترمذی کی اس روایت سے ابن ابی الدنیا ثقہ راوی کیسے بن گیا؟ ترمذی کی یہ روایت ابن ابی ملیکہ کی ہے اور اس میں صرف خطاب ہی خطاب ہے۔ جبکہ ابن ابی الدنیا کی روایت یوں ہے کہ مردے صرف سنتے ہی نہیں، جواب بھی دیتے ہیں۔ تو جب متنِ حدیث میں ہی اصول کی اختلاف ہو تو ابن ابی الدنیا کو کیسے معتبر راوی قرار دیا جا سکتا ہے؟

دخلته الا وانا مشدودۃ علی ثیابی حیاء من عمر مشکوٰۃ ص۱۵۴، شرح الصدور ص۸۴۔ ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں اپنے حجرۂ اقدس میں داخل ہوتی تھی جس میں رسولِ خدا علیہ السلام آرام فرما ہیں تو پردہ کا اہتمام نہ کرتی تھی اور دل میں کہتی تھی یہ تو میرے خاوند ہیں اور دوسرے میرے والد ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوتے تو بخدا میں بغیر اچھی طرح پردہ و حجاب کیے ہرگز داخل نہ ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حیا کرتے ہوئے[۱۳۱]

---

۱۳۱ فوت شدہ بزرگوں سے عورتوں کا پردہ؟

یہ روایت بھی کئی وجوہ کی بنا پر محلِ نظر ہے۔ مثلاً :۔

۱۔ یہ روایت مشکوٰۃ باب زیارت القبور کی تیسری فصل میں درج ہے اور مشکوٰۃ کی تیسری فصل کی بیشتر روایات ناقابلِ احتجاج ہیں جیسا کہ میں اس کتاب کے ص ۴ ۵ پر تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ یہ روایت صحاح میں کہیں مذکور نہیں۔ چوہدری صاحب نے خود بھی اس کا دوسرا حوالہ شرح الصدور سے دیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبور حضرت عائشہؓ کے حجرہ یا گھر میں ہی تو تھیں پھر حضرت عائشہؓ اپنے ہی گھر میں اور کہاں سے داخل ہوتی تھیں؟ آپؓ کا یہ گھر کوئی دو چار کنال کا بنگلہ تو نہ تھا کہ قبور کی طرف آئیں تو پردہ فرمالیں اور وہاں سے جانا ہو تو پردہ اٹھالیں۔ آپ کے اس گھر کے تقریباً تہائی حصہ میں یہ قبور تھیں، باقی جگہ آپ کی رہائش گاہ تھی۔ قبور کے ساتھ بیرونی دیوار تھی جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ ایک عبداللہ بن عمرؓ ہی ایسے صحابی تھے جو کبھی کبھار حضرت عائشہؓ سے اذن لے کر گھر کے دروازہ سے آتے اور تینوں قبروں کے پاس کھڑے ہو کر سلام کہتے تھے۔ حضور اکرمؐ کی قبر مبارک کو اس طرح بند رکھنے کی وجہ آپ کا یہ فرمان تھا کہ "میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنانا بلکہ دور و نزدیک جہاں کہیں سے بھی تم مجھ پر سلام پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔"

اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ حضرت عائشہؓ کب ایسا سخت پردہ کرتی ہوں گی اور کب اٹھاتی ہوں گی؟ ایسا سخت پردہ کرنے سے کیا یہی بہتر نہ تھا کہ وہ حضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں دفن ہونے کی اجازت ہی نہ دیتیں؟

اس روایت سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا نظریہ اہلِ قبور سے متعلق واضح ہو گیا کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حیاتِ برزخ کی قائل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند روایات مروی ہیں جن سے سماعِ موتیٰ ثابت ہوتا ہے جیسے "میت کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا[۳۴] زندہ شخص کی ہڈی توڑنا۔ (یہ سماعِ موتیٰ ثابت ہو رہا ہے — ناقل)

ان روایات کی روشنی میں جناب کیلانی صاحب کا یہ دعویٰ محض غلط ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سماعِ موتیٰ کی منکر ہیں۔

۳۴۔ حضرت عائشہؓ تو سماعِ موتیٰ کی بھی قائل نہ تھیں۔ اب یہ بعد از مرگ حضرت عمرؓ کے انھیں دیکھنے اور حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کا معاملہ تو اور بھی سخت ہے۔ پھر یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ اگر قبر پر منوں مٹی سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہ کو دیکھ سکتے ہوں تو معمولی کپڑے کا حجاب "الیحی نظر" کے لیئے روک کیونکر بن سکتا ہے؟

۳۴ کیا حیاتِ برزخ اور سماعِ موتیٰ لازم و ملزوم ہیں؟

چوہدری صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حیاتِ برزخ کی قائل ہیں ——— سوال یہ ہے کہ حیاتِ برزخ کا کون قائل نہیں؟ حیاتِ برزخ سے انکار تو عذاب و ثوابِ قبر کے انکار کے مترادف ہے۔ اور میں نے اپنے مضمون میں اس حیاتِ برزخ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اس حیاتِ برزخ سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فوت شدہ لوگ ہم اہلِ دنیا کی باتیں سنتے اور ان کا جواب بھی دیتے بلکہ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں؟

۳۵ سماعِ موتیٰ یا احترامِ آدمیت؟ اب تک چوہدری صاحب نے حضرت عائشہؓ کی جو تین مرویات پیش فرمائیں ان میں سے پہلی ابن ابی الدنیا کی ہے جو ناقابلِ احتجاج ہے، دوسری روایت، جس میں حضرت عائشہ کا اپنے بھائی کو خطاب مذکور ہے، کے راوی ابن ابی ملیکہ ہیں نہ کہ حضرت عائشہؓ خود۔ اس روایت کو خواہ مخواہ حضرت عائشہؓ کی مرویات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور تیسری روایت حضرت عمرؓ کی قبر سے حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کی ہے جس پر ابھی بحث ہوئی۔ اور یہی بات میں بہ تکرار ذکر کر چکا ہوں کہ موضوع،

مولانا جید الرحمٰن نے روح، عذاب قبر، سماع موتٰی سے متعلق مضمون کی دوسری قسط میں ایک جگہ لکھا ہے "حیرت کی بات ہے کہ سماعِ موتٰی اور اسی طرح سلوک و تصوف حنفیوں اور بالخصوص بریلوی طبقہ میں اتنا مقبول کیوں ہوگیا جبکہ امام ابوحنیفہ سماع موتی کے مخالف تھے۔ اور آگے امام صاحب سے متعلق واقعہ درج کیا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے سماع موتٰی کے متعلق نفی میں کچھ بھی ثابت نہیں اور جو روایات امام موصوف سے منسوب

مجروح اور ضعیف روایات ہی سماعِ موتٰی کے جواز کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ پھر ایسی روایات کو پیش کرنے کا فائدہ؟

اور اب سماعِ موتٰی کے جواز میں یہ چوتھی روایت پیش کر کے تو چودھری صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ع جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

ہم بصد احترام چودھری صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ اس حدیث میں قابلِ ذکر بات "احترام آدمیت" ہے نہ کہ سماعِ موتٰی۔ احترامِ آدمیت یہ ہے کہ:

۱۔ انسانی جسم انسان کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی ملکیت ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے جسم کو نہ نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے، نہ خودکشی کرنے کا۔

۲۔ صرف انسان کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ اسے درندے وغیرہ چیر پھاڑ نہ کھائیں۔ اور کسی جاندار کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم نہیں۔

۳۔ کوئی شخص بھی کسی انسانی لاش میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ حتٰی کہ خود مرنے والا بھی ایسی وصیت نہیں کر سکتا۔ مثلہ یعنی کسی انسانی لاش کے اعضاء کاٹنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ میت کی ہڈی توڑنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب اگر اس حدیث سے بھی چوہدری صاحب سماعِ موتٰی ثابت کرنا چاہیں تو ایسی سینکڑوں حدیثیں آپ کو اور بھی مل سکتی ہیں اور ہم پر "پہلے سے ایک نظریہ قائم کرنے کی وجہ سے نہ مانتے" کا الزام بھی بدستور برقرار رہے گا۔

۳۴۔ امام ابوحنیفہ رح سے منسوب روایات:

روایات کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں نے ایک روایت درج کی تھی، لیکن اور بھی روایات ہیں۔ اب یہ روایات شاذ ہیں یا ناقابلِ اعتبار، اس کا

کی جاتی ہیں وہ شاذ اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔
مسلک دیوبند کے نامور عالم مولوی رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں "امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اس باب میں کچھ منصوص نہیں اور وہ روایات جو کچھ امام صاحب سے آئی ہیں، شاذ ہیں ـــــ فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۲۲۷

منکرین سماع کے امام اعظم اور سماعِ موتیٰ

مولوی اسماعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی محدث دہلوی صراطِ مستقیم صفحہ ۱۶۶ پر رقمطراز ہیں ترجمہ "سید احمد بریلوی کو سلسلہ چشتیہ کی نسبت حاصل ہونے کا بیان یہ ہے کہ ایک دن آپ حضرت خواجہ خواجگان خواجہ قطب الدین کاکی قدس سرہ کے مزار منور پر حاضر ہوئے اور مراقبہ کر کے بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں حضرت خواجہ کی روح پر فتوح سے ملاقات ہوئی اور آنجناب نے سید صاحب پر بہت توجہ فرمائی اور اس توجہ کی وجہ سے نسبت چشتیہ کے ابتدا نصیب ہو گئی"۔
جناب منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں "ایک روز ارواحِ مقدس

فیصلہ تو حنفی حضرات ہی کریں جن کے لیے آپ کے اقوال بھی حجت ہیں۔ ہم نے تو محض تائید کے طور پر یہ روایت درج کی تھی اور اس کا حوالہ حاضرِ خدمت ہے۔ دیکھیے (غرائب فی تحقیق المذاہب وتفہیم المسائل صفحہ ۹۱ محمد بشیر الدین)

حیرت تو اس بات پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی "مشہور" روایات جو سماعِ موتیٰ کے حق میں ہوں وہ تو پیش نہیں کی جاتیں اور جو روایات مشہور ہیں انھیں "شاذ" کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ کیا تحقیق کا یہی انداز ہوتا ہے؟ سماعِ موتیٰ کے رد میں

ہدایہ کی یہ عبارت بھی قابلِ غور ہے:
"وَكَذٰلِكَ الْكَلَامُ وَالدُّخُوْلُ لِاَنَّ الْمَقْصُوْدَ مِنَ الْكَلَامِ الْاِفْهَامُ وَالْمَوْتُ يُنَافِيْهِ" (ھدایۃ ج ا ص ۴۸۴)
یعنی "اسی طرح اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں تم سے نہ کلام کروں گا نہ تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر مرنے کے بعد اس کی قبر کی زیارت کی

جناب غوث الثقلین سید عبد القادر جیلانی و حضرت بہاؤ الدین نقشبند متوجہ حال سید صاحب ہوئیں اور قریبًا ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان دونوں روحوں کے درمیان رہا ہر ایک روح ان دونوں روحوں میں سے سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایام تنازعہ کے دونوں روحوں کی بالاشتراک جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ تب دونوں ارواح مقدسہ نے بالاشتراک آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک پہر تک بہ نفس نفیس محو توجہ قوی اور تاثیر زود آور فرمائی کہ اس ایک پہر میں نسبت ان دونوں خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔ سوانح احمدی ص۶۵-۶۴

یہ روایت صراطِ مستقیم میں بھی درج ہے۔

اب یہ معمہ[۳۵] تو گیلانی صاحب ہی حل فرمائیں گے کہ کیا سید صاحب پر توجہ ڈالنا اتنا ہی ضروری تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے ارواح قدست اسرارہم علیین اور اعلیٰ علیین کی نعمتیں اور بلند مقام چھوڑ کر ایک ماہ تک آپس میں جھگڑتی رہیں۔

کیا گیلانی صاحب یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اگر اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ اور وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ کا اطلاق صرف فوت شدہ بزرگوں پر ہی ہوتا ہے تو سید احمد بریلوی مزار خواجہ قطب الدین علیہ الرحمۃ پر کیا لینے

یا کلام کیا تو قسم نہ ٹوٹے گی کیونکہ کلام سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے اور موت اس (افہام) سے روک دیتی ہے!"

۳۵ معمہ کس کے لیے؟

جو حضرات عالم بھی ہوں اور طریقت و سلوک میں بھی ان کا دامن اُلجھا ہوا ہو، ان کے ذہنی انتشار کی بھی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی، سید اسماعیل شہید، ابن حجر مکی وغیرہم سب اسی قبیل سے ہیں۔ اب ایک طرف شاہ ولی اللہ کی کتاب "البلاغ المبین" دیکھیے۔ اور دوسری طرف "انفاس العارفین" اسی طرح شاہ اسماعیل کی کتاب تقویۃ الایمان دیکھیے پھر صراطِ مستقیم، آپ کو یہ یقین ہی نہ آئے گا کہ یہ ہر دو کتب ایک ہی

گئے تھے۔ اگر پکارنے والے کی پکار کی خبر نہیں ہوتی تو وہاں سیّد صاحب کی ملاقات کس سے ہوئی تھی۔ اگر انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو شاہِ نقشبند کو بخارا میں اور شاہ جیلان کو بغداد میں کیسے خبر ہوئی کہ ہندوستان میں کوئی سیّد احمد بریلوی نامی بھی شخص ہے چل کر اس پر توجہ ڈالی جائے جس کی تشہیر بزعم خود توحید پرستوں کے امام ازل مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی نے صراط مستقیم میں کی ہے۔

آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ محدّث جو کہ کتاب وسنّت کی روشنی میں آزادانہ بحث وتحقیق کا حامی ہے تصویر کا دُوسرا رُخ شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا تا کہ " محدث " کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں۔

مخلص :- چوہدری محمد علی حنفی

مُصنّف کی لکھی ہوئی ہیں۔ دونوں کتابوں میں ایک دوسری کا مکمل ردّ موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ نے صراطِ مستقیم ملاحظہ فرمائی ہے تو تقویۃ الایمان بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارے لیے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی حجت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کو بھی پرکھنے کا معیار یہی ہے کہ انہیں کتاب وسنّت پر پیش کیا جائے اور " خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ " کے اصول پر عمل کیا جائے۔

رہی یہ بات کہ سیّد احمد شہید کو چشتیہ نسبت کیسے حاصل ہوئی اور قادریہ کیسے ؟ آخر سیّد احمد میں کونسی خوبی تھی کہ بغداد سے پیرانِ پیر کی رُوح توجہ ڈالنے کے لیے آ گئی اور دُوسری طرف سے قطب الدین بختیار کاکی کی رُوح تشریف لائی، پھر ان روحوں میں ایک ماہ تک تنازعہ ہوتا رہا۔ بالآخر سمجھوتہ کی صورت میں صلح ہو گئی اور سیّد احمد کو دونوں نسبتیں حاصل ہو گئیں۔ وغیرہ وغیرہ ..... اگر ہم ان واقعات کو درست سمجھتے ہوں تو پھر تو معمّہ بھی سمجھیں ورنہ یہ معمّہ کیسا اور ان کو حل کرنے کے ہم مکلّف کیونکر ؟ ـــــ ایسے کشفی واقعات و حالات کی حیثیت خواب کی سی ہوتی ہے جنھیں اہلِ طریقت وسلوک خود بھی حجت تسلیم نہیں کرتے !

(عبد الرحمٰن کیلانی)

